خطباتِ حجاز

جلد سوم

مؤلف

مولانا جنید احمد سیوانی قاسمی
سابق استاذ دار العلوم، دیوبند

خطباتِ حجاز

جلد سوم

تاثرات ودعائیہ کلمات

محبوب العلماء والصلحاء، حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد صاحب
نقشبندی مجددی مدظلہ العالی

مقدمہ

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مدظلہ العالی
مہتمم دارالعلوم دیوبند، انڈیا

مؤلف

مولانا جنید احمد سیوانی قاسمی

سابق امام وخطیب مسجد الرضوان، جدہ، سعودی عرب
سابق استاذ دارالعلوم، دیوبند

ناشر

AL-HARAM

مکتبہ الحرم، دیوبند، انڈیا

جملہ حقوق محفوظ ہیں ©

کتاب کا نام : خطباتِ حجاز

مؤلف : مولانا جنید احمد سیوانی قاسمی

طبع اول : ۱۴۴۵ھ = ۲۰۲۴ء

صفحات : ۳۵۰

قیمت : ......

ناشر : مکتبہ الحرم، دیوبند، انڈیا
Mob: 8859220801

Book’s Name : Khutbat – e – Hijaz

Author : Maulana Juned Ahmad Siwani

First Published : 2024

Published by : Maktaba Alharam Deoband, INDIA
Mob: 8859220801

فہرست

○ تأثرات اور دعائیہ کلمات ـــــ محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی مدظلہ العالی ــــــ ۱۵
○ مقدمہ ـــــ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہ العالی ــــــ ۱۶
○ حرفِ آغاز ـــــ مؤلف ــــــ ۱۸

فریضۂ حج ـــ اَسرار و حِکَم ۲۳

○ حج کی ادائیگی کا حکم ــــــ ۲۳
○ حج کیا ہے؟ ــــــ ۲۴
○ حج دراصل ایک مسلمان کی فکر و نظر کو وسیع کرتا ہے ــــــ ۲۶
○ حقیقی مساوات کا عملی نمونہ ــــــ ۲۷
○ حج ـــ اتحادِ امت کانفرنس ــــــ ۲۸
○ حج ـــ امن و سلامتی کا پیغام ــــــ ۲۹
○ دہشت گردی کے خلاف منشور ــــــ ۳۰
○ خلاصۂ کلام ــــــ ۳۲

اللہ کے دوست ۳۴

○ اللہ کے ولی کون ہیں؟ ــــــ ۳۴
○ اللہ کے ولیوں کے دو خصوصی اوصاف ــــــ ۳۵

○ امت کے سب سے بڑے ولی ۳۶
○ اولیائے کرام کی تین قسمیں ۳۸
○ اللہ کے دوست سے عداوت کا برا انجام اور نفلی عبادات کا مقام ۳۹
○ ولایت اور دعاؤں کی قبولیت ۴۱
○ قبولیتِ دعا کی ایک مثال ۴۲
○ قبولیتِ دعاء کا دوسرا واقعہ ۴۳
○ سچے ولی کی پہچان ۴۴

سکونِ دل کا راز ۴۹

○ سکونِ دل کا صرف ایک بنیادی سرچشمہ ۵۰
○ دل کی دو کیفیات ۵۲
○ روزِ اول سے بے ایمان کے لیے "تنگ زندگی" کا فیصلہ ۵۳
○ مؤمن، احساسِ تنہائی کی اذیت سے محفوظ ۵۴
○ اجتماعیّت کا احساس اور سکونِ دل ۵۶
○ ہجرت کی مشکل گھڑی میں سکینت کا نزول ۵۸
○ محبت میں تلخیاں بھی شیریں ہوتی ہیں ۶۰
○ نماز اور تسکینِ دل ۶۲

تزکیۂ نفس ۶۴

○ نفس کی حفاظت ۶۵
○ انبیائے کرام علیہم السلام کا اہم فریضۂ منصبی "تزکیۂ نفس" ۶۶
○ تزکیہ کے معنی ۶۷

○ تزکیۂ نفس کے اسباب و عوامل ۶۸
○ محاسبۂ نفس کی دو قسمیں ۷۳
○ دوسروں کی عیب جوئی کے بجائے اپنا محاسبہ کریں ۷۴
○ آخری بات ۷۵

استغفار اور اس کے منافع ۷۷

○ استغفار کی توفیق — اللہ کی خاص نعمت ۷۷
○ گناہوں سے زمین بھر جائے ۷۹
○ انسان سے گناہ کا سرزد ہونا باعثِ حیرت نہیں ۸۱
○ پروردگار کی بارانِ بخشش پہ قربان جاؤں ۸۲
○ استغفار کے دنیوی منافع ۸۳
○ استغفار کس طرح کریں؟ ۸۷
○ نبیؐ معصوم، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار ۸۸
○ سَحر کے وقت کا استغفار ۸۹

ظاہری آراستگی اور صفائی ستھرائی ۹۱

○ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا ۹۱
○ وضو اور غسل —— ظاہری طہارت کے مظاہر ۹۲
○ وضو اور غسل کی وجہ سے مسلمان قیامت کے روز بھی روشن جبیں ۹۳
○ دانتوں کی صفائی کی اہمیت ۹۴
○ معاشرے کا لحاظ اور احترام ۹۵
○ ظاہر کو سنوارنا بھی مطلوب شریعت ہے ۹۶

○ ظاہری رکھ رکھاؤ کی فکر اور اصلاحِ باطن سے غفلت ۹۷
○ پراگندگی کو ولایت اور بزرگی سمجھنا اسلام پر بہتان ہے ۹۸
○ راستوں اور گھروں کی صفائی کا اہتمام ۱۰۰
○ صفائی ستھرائی اور تندرستی کا باہمی ربط ۱۰۱
○ خلاصۂ گفتگو ۱۰۳

انسانیت کی خدمت ۱۰۴

○ بہترین انسان ۱۰۴
○ حاجت مند ہمارا محسن ۱۰۶
○ نفع رسانی ــــ حصولِ خیر اور دفعِ شر کا ضامن ۱۰۷
○ خیر خواہی صدقہ ہے ۱۰۸
○ نفع رسانی، دخولِ جنت کا سبب ۱۰۹
○ نفع رسانی ــــ ذاتی اور متعدّی ۱۱۱
○ صلح کرانا ۱۱۴
○ مالی نفع رسانی ۱۱۵
○ ابودحداحؓ نے نفع کا سودا کیا ۱۱۵
○ خلاصۂ کلام ۱۱۶

امیدِ ثواب اور خوفِ عقاب ۱۱۸

○ امید و خوف کے فوائد ۱۱۸
○ نیک عمل پر اللہ کی بے پناہ نوازش اور برے عمل پر سخت سزا ۱۲۰
○ امید غالب ہو یا خوف ۱۲۱

○ دو خوف اور دو امن اکٹھے نہیں ہو سکتے ۱۲۲
○ اپنا محاسبہ ۱۲۴
○ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور خوفِ آخرت ۱۲۴
○ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور خشیت الٰہی ۱۲۵
○ قابل رشک مکانات ۱۲۷
○ خوفِ خدا کی علامات ۱۲۸
○ مہربان رب کی رحمت سے مایوس نہ ہو ۱۲۹

امام بخاریؒ —— شخصیت و کارنامے ۱۳۰

○ مشہور ترین امامِ حدیث ۱۳۱
○ کتاب اللہ کے بعد افضل ترین کتاب ۱۳۱
○ امام بخاریؒ کے چند نمایاں اوصاف ۱۳۲
○ احترامِ علم اور عزتِ نفس ۱۳۵
○ امام صاحبؒ کے تمام علمی اسفار کی مسافت اور ان کے مشائخ کی تعداد ۱۳۶
○ لازوال علمی ذخیرہ اور اس کے ثمرات ۱۳۷
○ محاسنِ اسلام کا نمایاں ترین پہلو ۱۳۸
○ امام بخاریؒ کی رحلت اور ان کے کارنامے کی مقبولیت ۱۴۰

اسلام کے خلاف کیے جانے والے چند اعتراضات کے جوابات ۱۴۱

○ حاسدین کے چند اعتراضات ۱۴۲
○ جواب سے پہلے ایک وضاحت ۱۴۳

○ حقوق وواجبات میں اختلاف کی وجہ ۱۴۴
○ باپ کی وراثت میں لڑکی کا حصہ بہ نسبت لڑکے کے آدھا کیوں؟ ۱۴۵
○ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ۱۴۷
○ مرد کو عورت کا نگراں بنایا گیا ہے ۱۴۸
○ مفروضہ تین شکلیں ۱۴۹
○ اسلام میں مرد کے لیے ایک سے چار تک بیویوں کی اجازت کیوں؟ ۱۵۱
○ مسئلے کی مزید وضاحت ۱۵۲

برکت اور بے برکتی ۱۵۵

○ برکت کیا ہے؟ ۱۵۶
○ بابرکت ہستیاں ۱۵۶
○ بابرکت مقامات ۱۵۸
○ مبارک اوقات ۱۶۱
○ برکت کے آثار ۱۶۱
○ حصولِ برکت کے اسباب ۱۶۲
○ اہل خانہ کو سلام ۱۶۲
○ کھانے میں برکت کے اسباب ۱۶۳
○ صبح کی برکت ۱۶۵
○ تقویٰ اور اہل تقویٰ کی برکات ۱۶۵
○ صلۂ رحمی کی برکت ۱۶۷
○ خرید وفروخت میں صداقت وامانت ۱۶۷

○ بابرکت نکاح ۱۶۸

○ بے برکتی کے اسباب ۱۶۹

اسلام میں داڑھی کی اہمیت ۱۷۰

○ رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی پیروی زندگی کے تمام گوشوں میں ۱۷۱

○ داڑھی رکھنے کی تاکید ۱۷۲

○ داڑھی رکھنا تمام انبیائے کرامؑ اور تمام صحابۂ کرامؓ کا معمول ۱۷۴

○ داڑھی رکھنا عادت ہے یا عبادت؟ ۱۷۵

○ ذرائعِ ابلاغ کا منفی اثر ۱۷۶

○ داڑھی منڈانا حرام ہے ۱۷۸

○ خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت اور دائمی راحت ولذت ۱۷۹

○ ظاہری اور باطنی پاکیزگی ۱۸۰

اسلام کی پسندیدہ شخصیت ۱۸۲

○ خیر کے دروازے بھی کھلے ہیں اور شر کے دروازے بھی ۱۸۳

○ شرور وفتن سے کون بچے گا؟ ۱۸۳

○ حضرت حبیب بن زیدؓ کی صلابتِ ایمانی کا بے مثال واقعہ ۱۸۵

○ طاقت ور شخصیت کے طاقت ور فیصلے ۱۸۷

○ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی ۱۸۸

○ ہر بڑا اِقدام قوتِ ارادی کا طالب ہے ۱۹۰

○ غیبت، انسانی کم زوری کا دوسرا نام ہے ۱۹۱

○ اصول پسندی اور استغناء ۱۹۲

سفر اور مسافر — آداب واحکام ۱۹۳

○ محاسنِ سفر ۱۹۴
○ سفر کے خصوصی احکام ۱۹۷
○ آدابِ سفر ۱۹۹
○ سفر سے متعلق دعائیں ۲۰۲
○ مسافر کے لیے چند نصیحتیں ۲۰۳

ذکرُ اللہ — فضائل واقسام ۲۰۶

○ ذکرِ الٰہی کا رسیا، زندگی سے بیزار نہیں ہوتا ۲۰۸
○ کثرتِ ذکر علامت ہے جانبین سے محبت کی ۲۰۸
○ حضرت اُسید بن حُضیر کی قراءت اور فرشتوں کا نزول ۲۱۰
○ ذکر کے چند فوائد ۲۱۱
○ تمام طاعات کا مقصد ذکر اللہ کا قیام ۲۱۳
○ ذاکرین پر اللہ تعالیٰ کو فخر ہے ۲۱۴
○ ذکر کی تین قسمیں ۲۱۵

حَبر الامۃ حضرت ابن عباسؓ — سیرت وکردار ۲۱۸

○ نوجوانی کی عمر ۲۱۸
○ ابن عباسؓ کا خوب صورت جواب ۲۲۰
○ اور حضور ﷺ کی ان کے علم وفہم کے لیے دعا ۲۲۰
○ ”یہ نوجوان مجھ سے زیادہ سمجھ دار نکلا“... ۲۲۱
○ علم پسند زبان اور فہیم دل ۲۲۳

○ حضرت عمرؓ کی مجالس میں حضرت ابن عباس کا مقام و مرتبہ ۲۲۳
○ اس نوجوان کو اپنا شیخ کیوں بنایا؟ ۲۲۶
○ وقت کی حفاظت اور خشیتِ الٰہی ۲۲۶
○ نوجوانوں کے لیے صالح نمونہ ۲۲۸

اسلام میں شادی خانہ آبادی — تعلیمات وہدایات.... ۲۳۰

○ دینِ فطرت ۲۳۰
○ نکاح کی ترغیب ۲۳۲
○ نکاح کے سلسلے میں اسلاف کے اقوال ۲۳۴
○ نکاح کے فوائد ۲۳۵
○ حلال کو آسان اور حرام کو مشکل کرو ۲۳۸
○ شادی کے سلسلے کی رکاوٹیں ۲۴۰
○ آسان شادیوں کے چند نمونے ۲۴۱

دینی غیرت اور عزتِ نفس ۲۴۳

○ عزتِ نفس اور تکبر کے درمیان فرق ۲۴۴
○ ایمانی غیرت اور عزّتِ نفس کی ایک اعلیٰ ترین مثال ۲۴۶
○ احساسِ کمتری اور مایوسی کے اسباب ۲۵۱
○ خلاصۂ گفتگو ۲۵۳

زاہدانہ زندگی اور فکرِ آخرت ۲۵۵

○ دنیاوی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے ۲۵۶
○ زہد و قناعت اور شکر گزاری کا راز ۲۵۷

○ صحابۂ کرامؓ کی زاہدانہ زندگی ۲۵۹
○ حضرت ابوالدرداءؓ کی زاہدانہ زندگی کی ایک جھلک ۲۶۰
○ خالق اور مخلوق کی محبت کا راز ۲۶۴
○ دنیا کے فتنے سے بچو ۲۶۴
○ حضرت محمد بن واسع الازدیؒ اور ہیرے جواہرات سے مُرصّع تاج ۲۶۶

سلوک و معرفت ۲۶۸

○ اللہ کا دھیان اور ترکِ معاصی ۲۷۰
○ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور بکریوں کا چرواہا ۲۷۰
○ امام احمد بن حنبلؒ اور خشیتِ الٰہی ۲۷۲
○ حضرت معاذ بن جبلؓ کا حال سکرات کے وقت ۲۷۴
○ صفتِ احسان، ایمان کا اعلیٰ مرتبہ ۲۷۷

اسلامی اُخوّت اور دینی حمیّت — تقاضے اور فوائد ۲۸۱

○ پوری امت ایک جسم کی طرح ہے ۲۸۳
○ ایک مسلم عورت کے حجاب کا مسخرہ اور ایک مسلمان کی غیرتِ ایمانی ۲۸۳
○ رابطۂ اسلامی کے تقاضے ۲۸۵
○ جلاوطن اور پناہ گزین مسلمان ۲۸۷
○ انانیت اور خود پسندی ۲۹۰

ریاکاری، ایک بڑی بیماری ۲۹۲

○ تصنّع سے باز رہیں ۲۹۳

○ مقبولیت، اخلاص کا نتیجہ ہے ۲۹۴
○ خالق کی رضا کو اپنا نصب العین بنائیں ۲۹۵
○ ریاکار، دھوکہ باز ہے ۲۹۷
○ ریاء کے خوف سے ترکِ عمل ۲۹۹
○ فوری بشارت ۳۰۲

اسلامی شخصیت کے تین بنیادی عناصر ۳۰۴

○ جسمانی قوت ۳۰۴
○ جسمانی صحت کی بربادی کے اسباب اور ان کی حرمت ۳۰۶
○ جسمانی صحت کے بغیر عبادات کی ادائیگی بھی مشکل ۳۰۸
○ طاقت ور مومن بہتر ہے کم زور مومن سے ۳۰۹
○ اسلامی شخصیت کا دوسرا بنیادی عنصر ۳۱۰
○ دارین کی کامیابی کی فکر ۳۱۳
○ اسلامی شخصیت کا تیسرا عنصر: روحانی قوت ۳۱۴

خوش نصیب اور بد نصیب ۳۱۶

○ "نصیب" کی حقیقت کیا ہے؟ ۳۱۶
○ خوش قسمت انسان کون ہے؟ ۳۱۷
○ "محروم" شخص کون ہے؟ ۳۲۳

عید الفطر ــــ شکر و امتنان اور فرحت و سعادت ۳۲۷

○ عید کیا ہے؟ ۳۲۸

○ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے ۳۲۹
○ عید، دلوں کی کدورت دور کرنے کا حسین موقع ۳۳۰
○ قوموں کی حقیقی صورت ان کی تقریبات میں ۳۳۲
○ ان کو فراموش نہ کریں ۳۳۳
○ رمضان کی کمائی برباد نہ کریں ۳۳۳
○ طاعات پر استقامت اور مداومت (پابندی) ۳۳۴
○ قبولیت کی علامت ۳۳۵

عیدالاضحیٰ ــــ مقاصد واحکام ۳۳۷

○ قربانی اور اس کا پس منظر ۳۳۹
○ اس قصے کے درخشاں اور قابلِ عبرت پہلو ۳۴۲
○ قربانی کے فضائل ۳۴۳
○ قربانی کے احکام ۳۴۴
○ قربانی پر کیے جانے والے چند اعتراضات اور ان کے جوابات ۳۴۷
○ آخری بات ۳۵۰

***

تاثرات اور دعائیہ کلمات

از محبوب العلماء والصلحاء حضرت اقدس مولانا پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

جمعۃ المبارک کے بیانات و خطبات، دعوتِ دین اور اسلامی تعلیمات کو معاشرہ میں پھیلانے اور ہر خاص وعام تک پہنچانے کا وہ مقبول و معروف سلسلہ ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ الحمد للہ مولانا جنید احمد سیوانی صاحب کے نہایت محنت و اخلاص سے دیے گئے یہ بیانات جو کہ دین کے تقریبًا تمام شعبوں سے متعلق ہیں، کافی جامع اور مفید ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت انہیں صدق و اخلاص اور اپنی رضائے کاملہ عطا فرمائیں اور ان خطبات کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما کر ان کے لیے ذریعہ نجات بنائیں اور پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے، آمین۔

كان الله له عوضًا عن كل شيء.

(حضرت مولانا پیر) فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

۱۸/جنوری ۲۰۲۴ء

مقدمہ

حضرت مولانا مفتی ابو القاسم صاحب نعمانی مدظلہ
مہتمم دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماشاء اللہ خطباتِ حجاز کی جلد دوم اور سوم بھی منظر عام پہ آگئی، تینوں جلدوں کے عناوین اور مضامین پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ مؤلف کتاب جناب مولانا جنید احمد صاحب نے ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور معاشرت کے موضوعات پہ نہایت خوب صورتی کے ساتھ مؤثر انداز میں خطبات پیش کیے ہیں، جو تہذیبِ اخلاق، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے ان شاء اللہ مفید اور معاون ثابت ہوں گے۔

ہماری دعاء ہے کہ مولائے کریم اس خدمت و کاوش کو مؤلف موصوف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، قبول فرمائے اور امت کو اس سے نفع پہنچائے۔

جلد اول کے مقدمے میں تحریر کیا گیا تھا:

"خطباتِ حجاز" کے نام سے تذکیر و موعظت پر مشتمل معتبر مضامین کا مجموعہ سامنے آیا، جو اپنے نام کا صحیح مصداق ہے کہ وہ اُن خطبات کا خلاصہ ہے جو اس کے مؤلف محترم نے حجاز مقدس کے مشہور شہر "جدہ" کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز سے پہلے پیش کیے ہیں۔

اس کتاب کی فہرست سے اندازہ ہوا کہ اس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ

ضرورت کے بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، یہ جلد جو مؤلف موصوف کے بیان کے مطابق اس کتاب کی پہلی جلد ہے، تقریبًا تیس عنوانات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں خاص بات یہ ہے کہ متعلقہ موضوع پر آیات واحادیث اور معتبر واقعات ایک ایسے انداز میں جمع کیے گئے ہیں، جو قاری اور سامع پر اثرانداز ہوتا ہے، کتاب پر نظر ڈالنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سرسری تقاریر کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ محنت سے تیار کیے گئے عربی خطبات کا وہ خلاصہ ہے جسے صاحبِ خطبات نے خود سلیقہ کے ساتھ اردو کا جامہ پہنایا ہے، کتاب کی زبان میں سلاست اور بیان میں تاثیر ہے۔

مؤلف کتاب جناب مولانا جنید احمد صاحب سیوانی زید مجدہ، جدہ میں امامت وخطابت سے پہلے، دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ شعبۂ عربی کے استاد کی حیثیت سے کئی سال تدریسی خدمت انجام دے چکے ہیں، پھر جدہ منتقل ہوگئے اور پچیس سال سے وہاں ایک مسجد کے امام وخطیب ہیں۔

میری دعاء ہے کہ اللہ رب العزت موصوف کی اس کتاب کو مقبولیت عطاء فرمائے اور اُن کو مزید علمی ودینی خدمات کی توفیق سے نوازے۔ آمین

والسلام

(مولانا ومفتی) ابوالقاسم نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۵/ شوال ۱۴۴۵ھ

۱۵/ اپریل ۲۰۲۴ء بروز پیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

الْحَمد لله رب الْعَالمين، وَالصَّلَاة وَالسَّلَام على سيدنَا ونَبِيّنا مُحَمَّدٍ وعَلى آله وَأَصْحَابه أَجْمَعِينَ.

"خطباتِ حجاز" کی جلد اول کی طباعت کے بعد یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ جلد ہی دوسری اور تیسری جلد کا کام ایک ساتھ مکمل کر کے بیک وقت دونوں کی طباعت کرائی جائے، لیکن قدرتی طور پر ان کے ترجمے اور مسوّدے کی تیاری میں اندازے سے زیادہ وقت لگ گیا، جس کے پیچھے ناگہانی اور غیر متوقع اسباب تھے، تاہم دیگر مصروفیات کے باوجود محض اللہ کی توفیق سے ان دونوں جلدوں کا کام پورا ہو گیا اور کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر کر اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

جلدِ اول کے پیش لفظ میں لکھا گیا تھا:

"راقم الحروف ۱۴۱۷ھ = ۱۹۹۶ء سے سعودی عرب کے مشہور شہر جدہ کی ایک جامع مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دے رہا ہے، سینکڑوں موضوعات پہ خطبے پیش کیے، عام طور پر بیس پچیس منٹ خطبے کا وقت ہوتا ہے، ہر سال کی مخصوص عبادتوں کی مناسبت سے کچھ خطبوں کے موضوعات تو مکرر

ہوتے ہیں، ان کے علاوہ سارے خطبے متنوّع اور جدید موضوعات پر دیے جاتے ہیں: عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور معاشرت وغیرہ کے موضوعات ان میں شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح اس عاجز کے پاس مختلف عناوین کے سینکڑوں خطبات جمع ہو گئے۔

متعدّد مخلص دوستوں اور بزرگوں نے بارہا تقاضا کیا کہ ان خطبات کی عربی (جس زبان میں پیش کیے گئے) اور اردو، دونوں زبانوں میں طباعت ہونی چاہیے، تاکہ ان کا نفع مزید عام ہو جائے۔ اللہ کی توفیق سے عربی سے قبل ہی اردو زبان میں ترجمے اور طباعت کی ابتدا ہو رہی ہے۔

راقم نے خود ہی ان خطبات کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے... ہر خطبے کے شروع میں مفصل حمد وصلاۃ اور تقوے کی تلقین کے ساتھ اس سے متعلق چند آیات کی تلاوت کی جاتی ہے، جن کو طوالت کے اندیشے سے حذف کر دیا گیا ہے، نیز، ہر جمعے میں دو خطبے دیے جاتے ہیں جن کو ترجمہ کرتے وقت مضمون کا تسلسل برقرار رکھتے ہوے ایک کر دیا گیا ہے۔

ان خطبات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی مقدس آیات تو ذکر کی ہی گئی ہیں، ساتھ ہی مستند اور قابل اعتماد روایات بھی ذکر کی گئی ہیں، غیر مستند اور ناقابل اعتماد روایات سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے...''۔

۲۰۲۱ء میں پہلی جلد کی طباعت ہوئی تھی، اس وقت سے اب تک قارئین کرام کے

بہت سارے مثبت اور حوصلہ افزا تبصرے موصول ہوے، بالخصوص مساجد کے ائمۂ کرام نے تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور کتاب کی افادیت اور حسن اسلوب کی پذیرائی کی، عمومی طور پر کتاب کے دلچسپ عناوین، سہل اسلوب، حسنِ کتابت وطباعت اور قرآن وسنت کے نصوص سے مُدلّل مضامین کا ذکر ان تبصروں میں ملتا ہے، جس کے لیے میں ان سبھی حضرات کا شکرگزار ہوں۔

ان حوصلہ افزا تبصروں کے ضمن میں ایک ایسی مبارک اور ہر دل عزیز شخصیت کا تبصرہ بھی ہے جسے یہاں نقل کرنے کے لیے دل بے تاب ہے:

۴/ رمضان المبارک ۱۴۴۳ھ کی شام میں مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین پر حاضری ہوئی، وہاں عالم اسلام کی معروف روحانی شخصیت محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار صاحب نقشبندی مجددی (حفظہ اللہ تعالیٰ ومتّعہ بالصحۃ والعافیۃ وبارک فی عمرہ) سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ ملاقات پہلی نہ تھی، بلکہ پچھلے کئی سالوں سے حضرت والا کی زیارت اور فیض یابی کی سعادت مل رہی ہے، چناں چہ حضرت والا کی خدمت میں اپنی کتاب خطباتِ حجاز کی پہلی جلد پیش کی، تھوڑی دیر بعد اجازت لے کر جدہ واپس ہوگیا۔

رات میں میرے مخلص ومحسن دوست حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زید مجدہ استاذ دارالعلوم دیوبند کا فون آیا، جو اس وقت مکہ مکرمہ میں تشریف رکھتے تھے، فرمایا کہ حضرت (پیر صاحب) نے آپ کو طلب فرمایا ہے، کل شام کی مجلس میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔

چناں چہ ۵/رمضان المبارک کو شام کی خصوصی مجلس میں حاضر ہو گیا، جس میں دس سے زائد شرکا موجود تھے، جو تقریباً سارے ہی حضرت کے خلفا اور مُجازِ بیعت تھے۔

اس طلب کا اصل مقصود تو عقیدہ و سلوک، دعوت و ارشاد اور اصلاحِ امت کے راہ نما اصولوں پر روشنی ڈال کر ان کی اہمت کو بیان کرنا اور ان کی ذمے داری ہمارے کاندھوں پر ڈالنا تھا، لیکن آغازِ مجلس میں ہی ان تمام حضرات کے سامنے حضرت نے اس کتاب کے حوالے سے گفتگو فرمائی اور خوب صورت انداز میں اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوے اس کے مطالعے کا بھی مشورہ دیا، جسے میں اپنے لیے باعثِ صد افتخار اور کتاب کی قدر و قیمت کے لیے بڑی سند سمجھتا ہوں۔

دوسری اور تیسری جلد کی طباعت سے قبل حضرت نے راقم پر مزید احسان فرمایا اور خطبات سے متعلق اپنے قیمتی تأثرات اور دعائیہ کلمات تحریری شکل میں عنایت فرمائے جس کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

ترجمے کا کام نہایت دقیق، لطیف اور نازک کام ے، اصل زبان اور ترجمے والی زبان دونوں پر مترجم کی بھرپور گرفت ہونا ناگزیر ہے، ورنہ اصل مفہوم کی ادائیگی کما حقہ نہیں ہوپائے گی۔ راقم نے اپنی کم مائیگی کے باوجود حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں کوئی پیچیدگی باقی نہ رہے، بلکہ آزاد ترجمہ کرکے اصل زبان کی روح کو برقرار رکھتے ہوے، اردو زبان کے قالب میں نہایت آسان، شستہ اور سلیس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ مشکل الفاظ و تعبیرات سے پرہیز کرنے کے ساتھ کتاب کو غیر معیاری اسلوب سے

بھی محفوظ رکھنے کی اپنی بساط کی حد تک سعی کی ہے۔ املا نویسی کے حوالے سے بھی اس کتاب میں اردو کے جدید رسم الخط کا بہت حد تک پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

کتاب کی طباعت کے سلسلے میں جن کرم گستروں نے تعاون کیا ہے ان کا تہہ دل سے شکرگزار اور ان کے لیے دعاگو ہوں، بالخصوص عزیز القدر مولانا ڈاکٹر قمرالدین صاحب قاسمی کا شکرگزار ہوں جنھوں نے کتاب وطباعت کے سلسلے میں نہ صرف رہنمائی کی، بلکہ اپنا قیمتی وقت فارغ کرکے عملی طور پر بے لوث ہوکر ہر مرحلے میں اس عاجز کے لیے دست وبازو بنے رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور تمام معاونین کو اجرعظیم اور دارین کی سعادتیں عطا فرمائیں۔

مولائے کریم اس کاوش کو قبول فرماکر اسے میرے لیے اور میرے والدین کے لیے صدقۂ جاریہ، ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے، والدین کی قبروں پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، نیز پوری امت مسلمہ کے ساتھ عفو وعافیت اور رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔

جنید احمد سیوانی قاسمی

۲۰/جنوری ۲۰۲۴ء

موبائل: 00966,551446792

ای میل: j.ahmad68@gmail.com

****

۱۴۲۵/۱۲/۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فریضۂ حج ــــ اَسرار و حِکَم

حج کی ادائیگی کا حکم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٩٧﴾﴾ [آل عمران: ٩٧]

"اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان پر اللہ کے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے، اور اگر کوئی انکار کرے تو اللہ دنیا جہان کے تمام لوگوں سے بے نیاز ہے"۔ [سورۂ آل عمران:۹۷]

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے، یہ ہر اس مسلمان کے اوپر فرض ہے جو عاقل، بالغ ہو، جسمانی اور مالی اعتبار سے اس کی ادائیگی کی قدرت رکھتا ہو اور دورانِ سفر اپنے اوپر اور اس عرصے میں اپنے اہل و عیال کے اوپر خرچ کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

موجودہ زمانے میں الحمد اللہ اس کا شکوہ اور گلہ نہیں ہے کہ لوگ حج کی ادائیگی میں

کوتاہی کر رہے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں حج کے لیے درخواستیں موصول ہوتی ہیں کہ قرعہ اندازی کی ضرورت پیش آتی ہے، ماشاء اللہ بیت اللہ، طواف کرنے والوں سے ہمہ وقت کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔

اس لیے آج کے خطبے میں حج کی ترغیب کے بہ جائے حج کے اَسرار ورموز اور ان حکمتوں کو بیان کرنا ہے جو اس عظیم فریضے کی ادائیگی میں مُضمر ہیں۔

حج کیا ہے؟

حج، دراصل ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار کا ایک نمونہ ہے، جنہوں نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ کی تعمیر فرمائی:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَٰهِـۧمُ ٱلْقَوَاعِدَ مِنَ ٱلْبَيْتِ وَإِسْمَٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾﴾ [البقرة: ١٢٧]

”اور اس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور اسماعیل بھی (ان کے ساتھ شریک تھے اور دونوں یہ کہتے جاتے تھے کہ): اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ (خدمت) قبول فرمالے، بیشک تو اور صرف تو ہی، ہر ایک کی سننے والا ہے، ہر ایک کو جاننے والا ہے“۔[سورۂ بقرہ:۱۲۷]

اس حج کو اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کا ایک امتیازی شعار بنایا ہے، اس میں ایک مسلمان حاجی اپنی روحانی بیٹری چارج کرنے کے ساتھ ساتھ وجد و سرور کی ایسی کیفیات محسوس کرتا ہے، جو اسے تازہ دم اور مزید عملِ صالح کے لیے سرگرم بنا دیتی ہیں۔

غور فرمائیں! ایک حاجی (اگر وہ مرد ہے تو) حرم پاک اور مشاعرِ مقدسہ کی طرف

جب حج کے لیے جاتا ہے تو اپنے معمول کے کپڑے بدن سے اتار دیتا ہے، وہ کپڑے جن میں صنعت کاری ہو، یا زیب وزینت ہو انہیں اتار پھینکتا ہے اور نہایت سادہ لباس یعنی احرام کی دو چادریں زیب تن کرتا ہے، یہ احرام کے کپڑے، مُردوں کے کفن سے بہت حد تک مشابہت رکھتے ہیں؛ چناں چہ جب حاجی، ہر طرح کے زیب وزینت اور امتیازی اور قیمتی لباس کو جسم سے اتار کر، ان سادے کپڑوں میں ملبوس ہوکر

«لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لا شَرِيكَ لَكَ».

”حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، حمد وستائش، نعمتیں اور حکمرانی تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں“۔

کی صدا بلند کرتا ہے تو اس کے اندر حیرت انگیز احساسات وجذبات کا سمندر امنڈ پڑتا ہے، اس صورتِ حال اور ان الفاظ کے معانی پہ غور کرکے بے ساختہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کے گُن گانے لگتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے گویا کہ از سر نو اس کی پیدائش ہوئی ہے، لہٰذا جب وہ حج سے واپس ہوتا ہے اپنے گناہوں پہ شرمندہ، پاکیزہ دل، اور طاعات پر پختہ عزم ہوکر واپس ہوتا ہے، اسی کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

«مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ، وَلَمْ يَفْسُقْ، رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ». [صحيح البخاري]

”جس شخص نے حج کیا، (لیکن) نہ تو اس سے کوئی فحش بات ہوئی نہ ہی کوئی گناہ سرزد ہوا، تو وہ اس دن کی طرح (گناہوں سے پاک صاف ہوکر) واپس ہوگا جیسے اس کی ماں نے اسے جنا تھا“۔ [بخاری شریف]

حج دراصل ایک مسلمان کی فکر و نظر کو وسیع کرتا ہے

حج کا مبارک سفر ایک مسلمان کو فکری اور ذہنی وسعت عطا کرتا ہے، اس کی فہم وفراست کے معیار کو بلند کرتا ہے اور اسے عالم اسلام سے مربوط کرتا ہے۔ جب وہ مشاعر مقدسہ میں پہنچتا ہے تو دنیا کے چپے چپے سے آئے ہوئے مختلف اجناس، مختلف زبانوں اور طبقات کے مسلمان بھائیوں سے ملتا ہے تو اسے معنوی تقویت حاصل ہوتی ہے، اسلام کی عالمگیریت اور آفاقیت کا بھرپور احساس ہوتا ہے اور دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے اپنے بھائیوں کا جم غفیر دیکھ کر فرطِ مسرت سے اس کا دل بھر آتا ہے۔

یہ وہ چند فوائد و منافع ہیں جن کا ہر حاجی کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتا ہے اور جن کا تذکرہ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

﴿ لِّيَشْهَدُواْ مَنَٰفِعَ لَهُمْ ﴾ [الحج: ۲۸]

"تاکہ وہ ان فوائد کو آنکھوں سے دیکھیں جو ان کے لیے رکھے گئے ہیں"۔

[سورۂ حج:۲۸]

بعض منافع تو مادی اور تجارتی ہیں، جب کہ بعض معنوی، قلبی اور روحانی ہیں۔

اسی طرح حج میں ان اعلیٰ اقدار کی عملی مشق کی جاتی ہے جن کی طرف اسلام نے متوجہ کیا ہے، بلکہ ہر مسلمان سے مطالبہ کیا ہے، مثال کے طور پر محنت، مشقت، جفاکشی اور مجاہدہ کی عادت اور عیش و عشرت اور تنعّم پسندی سے احتراز — چناں چہ جو مسلمان حج کے لیے جاتا ہے وہ اپنا وطن، اپنے اہل و عیال، اعزہ و اقارب اور دوست واحباب سب سے جدا ہوتا ہے، یہ سب اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کے مبارک گھر کی طرف

ہجرت کرتا ہے، سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے، منیٰ کی تنگ وادی میں اپنا پڑاؤ ڈالتا ہے، پھر عرفات کے وسیع و عریض میدان کی طرف جاتا ہے، غروب شمس کے بعد مزدلفہ کا رخ کرتا ہے، وہاں پہنچ کر کھلے آسمان کے نیچے رات گزارتا ہے، پھر صبح کے وقت دوبارہ منی کی وادی میں پہنچ جاتا ہے، وہاں پہنچ کر جمرات کی رمی کرتا ہے، مکہ مکرمہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، صفا مروہ کی سعی کرتا ہے... ان تمام اعمال میں مجاہدانہ اور مؤمنانہ زندگی کی عملی مشق ہے تاکہ ایک مسلمان یہاں سے یہ سبق لے کر جائے کہ تعیش پسندی سے پرہیز کرے اور محنت و مشقت کا خوگر بنے۔

حقیقی مساوات کا عملی نمونہ

اگر حقیقی مساوات کا منظر دیکھنا ہو تو احرام کی چادریں پہنے ہوئے حجاج کرام کے مبارک مجمع کو دیکھیں، اسلام نے جس انسانی مساوات کا نعرہ بلند کیا ہے کہ سارے انسان کنگھی کے دندانے کی طرح انسان ہونے میں برابر ہیں، اس کی حقیقی تصویر حج کے دنوں میں مشاعر مقدسہ میں نظر آتی ہے — یہ منظر جماعت کی نماز میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، ایک ہی صف میں غریب و مالدار، حاکم و محکوم اور خادم و مخدوم سب کھڑے ہوجاتے ہیں، تاہم نماز کی حالت میں ایک گونہ امتیاز باقی رہتا ہے، کیوں کہ قیمتی اور معمولی کپڑوں سے اور اپنے اپنے یونیفارم سے لوگ پہچان لیے جاتے ہیں کہ وہاں یکساں لباس کی کوئی قید نہیں؛ لیکن حج میں سارے حجاج کرام اپنے اپنے امتیازی لباس اتار کر وہی دو چادریں جسم پر ڈال لیتے ہیں جو کفن کے مشابہ ہوتی ہیں — اس طرح اسلام کی حقیقی مساوات کی جیتی جاگتی تصویر بنے سارے مردانِ خدا میدانِ عرفات میں ربّ ذوالجلال کے حضور میں کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس

کریم آقا سے اس کی مغفرت، رحمت، محبت اور خیر وعافیت مانگتے ہیں۔

اسی مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام تشریق کے وسط میں یہ ارشاد فرمایا تھا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِأَعْجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا لأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى».

[رواه أحمد]

”لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہے، غور سے سنو! کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقویٰ کے ساتھ ...“. [احمد]

حج ـــ اتحادِ امت کانفرنس

اسی طرح حج کی ادائیگی میں ”وحدتِ امت“ کی عملی مشق بھی ہے؛ پوری امت کا رب و معبود ایک ہے، جس نبی اکرم کی اتباع کا اسے حکم ہے وہ نبی ایک ہیں، اس کے سارے شعائر ایک طرح کے ہیں، سب کا ہدف اور مقصد ایک ہے، سب کا منہج ایک ہے ـــ یہ وحدت نمایاں طور پر حج میں نظر آتی ہے، چناں چہ یہاں مشاعر میں یکسانیت، شعائر میں یکسانیت، مقصود و مطلوب میں یکسانیت، سلوک وعمل میں یکسانیت، بلکہ تمام حاجیوں کے نعرے میں بھی یکسانیت دکھائی دیتی ہے، ہر ایک کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہوتا ہے: «لبيك اللّهم لبيك...» کا نعرہ، اس وحدت کو قرآنِ مقدس کی آیت کریمہ کی

عملی تفسیر بھی کہہ سکتے ہیں:

﴿إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ ﴿٩٢﴾﴾ [الأنبياء: ٩٢]

”یقین رکھو کہ یہ تمہاری امت ہے جو حقیقت میں ایک ہی امت ہے، اور میں تم سب کا پروردگار ہوں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو“۔[سورۃ انبیاء:۹۲]

لہٰذا پوری امت مسلمہ کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہونا چاہیے، جس کا ایک حصہ، دوسرے حصے کو تقویت دے، بالخصوص ایسے حالات میں جب امت پہ کوئی مشکل وقت آن پڑے، یا اس کے بدخواہ اس کے خلاف اپنی سازشوں کا جال بچھادیں، ایسے وقت میں ناگزیر ہے کہ پوری امت اپنی طاقتور وحدت کا مظاہرہ کرے۔

حج کے اجتماع کو ہم ربّانی کانفرنس بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ یہ وہ اجتماع ہے جس کا داعی خود ربّ ذوالجلال ہے، اس کانفرنس کا دعوت نامہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتِ اسلامیہ کے ان خوش قسمت لوگوں کے نام ہے جو اس حج کی ادائیگی کی استطاعت رکھتے ہوں، تاکہ کلمۂ حق کی بنیاد پر یہاں حاضر ہوکر ایک دوسرے کے ساتھ ہم دردی اور محبت و مودّت کا مظاہرہ کریں اور اس عالمی کانفرنس سے مستفید ہوں۔

حج — امن و سلامتی کا پیغام

اسلام نے حجِ بیت اللہ کے ذریعہ سارے عالم کو امن وامان اور سلامتی کا پیغام دیا ہے، کیوں کہ حج کی ادائیگی کے لیے جس خطۂ زمین کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے، وہ بلد حرام ہے، جو حقیقت میں ”ارضِ اسلام“ ہے، یعنی امن وامان کی سرزمین، اسی طرح بیت

اللہ کو امن وامان کا مقامِ مبارک بنایا، فرمایا:

﴿ وَإِذۡ جَعَلۡنَا ٱلۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمۡنًا ﴾ [البقرة: ١٢٥]

”ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے ثواب اور امن وامان کی جگہ بنائی“۔

[سورۂ بقرہ:۱۲۵]

یہ وہ مبارک خطۂ زمین ہے، جہاں ہر ایک کو امان نصیب ہوتا ہے، یہاں تک کہ فضا میں اڑنے والے پرندے اور خشکی کے شکاری جانور بھی یہاں مامون ہوتے ہیں، بلکہ اس زمین پر اگنے والے پودوں کو بھی امن نصیب ہوتا ہے، لہٰذا یہاں شکاری جانوروں کا نہ شکار کیا جاسکتا ہے، نہ پرندوں اور جانوروں کو خوف زدہ کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی وہاں کے درختوں کو کاٹا جاسکتا ہے، اس ”سلامتی کانفرنس“ کے توسط سے اقوامِ عالم کو امن وامان کا پیغام دیا گیا ہے۔ اس عبادت کو تربیت گاہ بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس میں مختلف قسم کے اعلیٰ اقدار کی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے، منجملہ ان کے امن وسلامتی کا درس بھی ہے، جس کا سرچشمہ دراصل سچا ایمان اور پکا عقیدہ ہے، اس کا تعلق ہمارے یہاں خوب صورت الفاظ اور فلک شگاف نعروں سے نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر سلامتی کے عالمی دعویدار کرتے ہیں اور قوموں کو دھوکہ دے کر ان کا استحصال کرتے ہیں، بلکہ ہمارے یہاں امن وسلامتی کی بنیاد ہی ایمان وعقیدہ، حق وصداقت اور عدل وانصاف ہے۔

دہشت گردی کے خلاف منشور

صلح وآشتی کی اسی سرزمین مقدس سے نبی رحمت، رسول اکرم محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام حج میں وہ تاریخی خطبہ دیا تھا جسے ”خطبۂ حجۃ الوداع“ کہتے ہیں، جس میں

آپؐ نے امن عامّہ کے اصولوں کو بیان فرمایا اور ظلم وزیادتی کی حرمت کو بیان فرمایا اور ہرانسان کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حرمت کو بھی واضح فرمایا، چناں چہ اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر آپؐ نے لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے استفہام اور سوال کا انداز اختیار کرتے ہوے فرمایا:

"یہ کون سا مہینہ ہے؟" صحابۂ کرامؓ کہتے ہیں: ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ آپؐ خاموش ہوگئے، حتی کہ ہم نے خیال کیا کہ آپ اسے اس کے معروف نام کے بجائے کوئی اور نام دیں گے، پھر آپؐ نے فرمایا: "کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے؟" ہم نے جواب دیا: کیوں نہیں! پھر آپؐ نے پوچھا: "یہ کون سا شہر ہے؟" ہم نے جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والے ہیں۔ کہا: آپؐ خاموش رہے، حتی کہ ہم نے خیال کیا کہ آپ اس کے مشہور نام کے علاوہ کوئی اور نام دیں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: "کیا یہ 'البلدۃ' (حرمت والا شہر) نہیں ہے؟" ہم نے جواب دیا: کیوں نہیں، پھر آپؐ نے دریافت فرمایا: "یہ کون سا دن ہے؟" ہم نے جواب دیا اللہ اور اس کے رسول سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا یہ یوم النحر (قربانی کا دن) نہیں ہے؟" ہم نے جواب دیا: کیوں نہیں یارسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا:

"بلاشبہ تمہارے خون، تمہارے مال– محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ انھوں نے یعنی راوی نے کہا: – اور تمہاری عزت وآبرو تمہارے لیے اسی طرح حرمت والے ہیں جس طرح اس مہینے میں، اس شہر میں تمہارا یہ دن حرمت والا ہے..."۔ [صحیح مسلم]

اس مقدس سرزمین سے جو حقیقت میں پاسبانِ امن وسلامتی اور عدل وانصاف ہے، ان انتہا پسندوں اور جادۂ حق سے منحرف گروہوں کو جھنجھوڑا گیا جو پر امن فضاء کو اپنی جارحانہ حرکتوں سے دہشت زدہ بنادیتے ہیں؛ بلکہ اپنی تنگ نظری اور جہالت کی وجہ سے اپنے ہی بھائیوں کا خون بہاتے ہیں اور روئے زمین پر فساد برپا کرتے ہیں۔

بلکہ اس میں ان عالمی تنظیموں کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے جو انسدادِ دہشت گردی کا نعرہ تو لگاتی ہیں، لیکن دوسرے معاشروں میں خود دہشت گردی پھیلاتی ہیں، جن ہتھیاروں پہ روک تھام کے لیے آواز بلند کرتی ہیں، ان ہی ہتھیاروں کو خود استعمال کرکے دوسرے ممالک کو تہس نہس کرتی ہیں اور اس طرح اپنی بالادستی ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں — اسلام اس طرح کے دوہرے پن کو پسند نہیں کرتا، اسلام، صداقت وامانت، امن وامان اور عدل وانصاف کی نہ صرف تعلیم دیتا ہے، بلکہ عملی جامہ پہنا کر – بالخصوص حج کے موقع پر – پوری کائنات کے سامنے اس مقدس سرزمین سے اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ گویا کہ یہ عالمی اسلامی کانفرس ساری دنیا کے انسانوں سے امن وامان کی اپیل کرتی ہے اور عملی طور پر اس ”ارض السلام“ سے اس کا حسین نمونہ پیش کرتی ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ حج مکمل طور پر ایمانی، اخلاقی، روحانی اور اجتماعی درس گاہ ہے، جہاں سے ایک مسلمان حاجی اپنی روح کی غذا بھی حاصل کرتا ہے، ایمان افزا مواقف سے تازہ دم ہوتا ہے، مختلف رنگ ونسل کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا سلیقہ سیکھتا ہے، اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ عبادت کرنے کی مشق کرتا ہے، امن وامان کے ساتھ

اتنے بڑے مجمع میں وقت گزارنے اور اسلامی رواداری کو دیکھنے اور سمجھنے بلکہ برتنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے، پورے عالم کے ہر خطے سے آئے ہوئے ضیوف الرحمن اور اپنے مسلمان بھائیوں سے مل کر فخر وشکر کی ملی جلی کیفیات سے اپنے دل کو معمور پاتا ہے، ایک طرح کے کپڑے میں ملبوس، ایک ہی طرح کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے بھائیوں کو دیکھ کر نہ اپنے قلب کی کیفیات پر قابو پاتا ہے نہ ہی اپنی آنکھوں کو اشک باری سے روک پاتا ہے، اس طرح اپنی آخرت کو بھی گویا کہ اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور توبہ واستغفار کرکے اپنے ماضی کے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے اس طرح اپنے وطن واپس آتا ہے کہ وہ اس حدیث پاک کا مصداق بنتا ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ:

”جس شخص نے حج کیا، لیکن نہ تو اس سے کوئی فحش بات ہوئی نہ ہی کوئی گناہ سرزد ہوا، تو وہ اس دن کی طرح (گناہوں سے پاک صاف ہوکر) واپس ہوگا جیسے اس کی ماں نے اسے جنا تھا“۔ [بخاری شریف]

پھر وہ اس مقبول حج کی وجہ سے اللہ کی جنت کا مستحق بنتا ہے، جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ». [متفق عليه]

”مقبول حج کا ثواب جنت کے سوا کچھ نہیں“۔ [متفق علیہ]

***

۱۴۲۵/۱۰/۲۰ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ کے دوست

اللہ کے ولی کون ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَلَآ إِنَّ أَوۡلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴿٦٢﴾﴾ [يونس: ٦٢]

"یاد رکھیں کہ جو اللہ کے دوست ہیں، ان کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے"۔[سورۂ یونس:۶۲]

یہ اللہ کے ولیوں اور اس کے دوستوں کے لیے بشارت دی گئی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ولی اور دوست ہیں کون لوگ؟ یہ سعادت مند اور خوش نصیب کون لوگ ہیں جو قیامت کے روز ہر طرح کے خوف وہراس اور رنج وغم سے محفوظ ہوں گے؟ جس دن کا منظر اس قدر اندوہناک ہوگا کہ کوئی کسی کی مدد کے لیے تیار نہ ہوگا، آدمی اپنے بھائی، ماں باپ، اپنی بیوی اور اولاد سے بھی جان چھڑا رہا ہوگا، ہر ایک کو اپنی ہی فکر دامن گیر ہوگی، اس دن کسی کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا، تمام تر حکم اس دن

اللہ ہی کا ہو گا۔

”جس دن کسی بھی شخص نے نیکی کا جو کام کیا ہو گا اسے اپنے سامنے موجود پائے گا، اور برائی کا جو کام کیا ہو گا اس کو بھی اپنے سامنے دیکھ کر یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کی بدی کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا...“۔[سورۂ آلِ عمران:۳۰]

اللہ کے ولیوں کے دو خصوصی اوصاف

خود اللہ پاک نے اپنے ولیوں کی دو صفات ذکر فرمائی ہیں: ایک ایمان دوسرے تقویٰ، فرمایا:

﴿ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ﴾ [يونس: ٦٣]

”یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا“۔[سورۂ یونس:۶۳]

ان دو اوصاف کا جو حامل ہو گا وہ ولی ہو گا، پہلا ایمان ہے، جس کا مطب یہ ہے کہ اللہ کی ذات وصفات پر ایمان لائے، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر، اللہ کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر، اور تقدیر پر ایمان لائے کہ بھلی ہو یا بری وہ سب اللہ کی طرف ہے۔

دوسرا تقویٰ ہے جس کا مفہوم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، قرآنِ پاک پر عمل کرنا، تھوڑے پہ راضی ہوجانا اور موت کی تیاری کرنا۔ متقی مومن وہی ہو گا جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی میں پیش پیش ہو گا، لہٰذا جو شخص ایسا ہو گا اس کے ولی ہونے میں کیا شبہ ہے؟

امت کے سب سے بڑے ولی

انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد امتِ مسلمہ کے سب سے عظیم ولی، صحابی جلیل، حضور ﷺ کے رفیقِ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پوری امت میں ان سے بڑا ولی نہ کوئی ہوا اور نہ ہوگا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ، وَلَا غَرَبَتْ، عَلَى أَحَدٍ بَعْدَ النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ أَفْضَلَ مِنْ أَبِي بَكْرٍ». [ابن حميد والخطيب]

"انبیاء ورُسل علیہم السلام کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے افضل شخص کے اوپر سورج نہ تو طلوع ہوا نہ غروب ہوا"۔ [ابن حمید والخطیب]

کوئی کتنی ہی عبادت کرلے، نماز روزے، حج وعمرے اور جہاد فی سبیل اللہ میں پوری زندگی صرف کردے، لیکن صدیق اکبر کے مقام ومرتبے کو نہیں پاسکتا، کیوں کہ ولایت ودوستی کا مقامِ رفیع اللہ تعالیٰ نے انہیں عنایت فرمایا تھا اور اپنے فضل سے امت کے ہر فرد پر انہیں فوقیت دی، اللہ اپنا فضل جسے چاہتا ہے اسے دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«مَنْ أَنْفَقَ زَوْجَيْنِ مِنْ شَيْءٍ مِنَ الْأَشْيَاءِ فِي سَبِيلِ اللهِ، دُعِيَ فِي الْجَنَّةِ: يَا عَبْدَ اللهِ هٰذَا خَيْرٌ. فَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصَّلَاةِ، دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّلَاةِ. وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْجِهَادِ، دُعِيَ مِنْ بَابِ الْجِهَادِ. وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ

الصَّدَقَةِ، دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّدَقَةِ. وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصِّيَامِ، دُعِيَ مِنْ بَابِ الصِّيَامِ وَمِنْ بَابِ الرَّيَّانِ...».

"جس شخص نے اللہ کے راستے میں کسی چیز کا ایک جوڑا خرچ کیا تو اسے جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا (ہر دروازہ کہے گا) اے اللہ کے بندے (ادھر آؤ) یہ بہتر ہے۔ جو شخص نمازی ہوگا اسے نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا، جو شخص مجاہد ہوگا اسے جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا، جو شخص اہل صدقہ میں سے ہوگا اسے صدقہ کے دروازے سے بلایا جائے گا، اور جو شخص روزہ دار ہوگا اسے "باب الصیام" اور "باب الریّان" سے بلایا جائے گا"۔

یہ سن کر حضرت ابوکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ جو شخص ان دروازوں سے بلایا جائے گا اسے تو کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں باقی رہے گی، لیکن، کیا کوئی ایسا بھی ہوگا جسے ان تمام دروازوں سے بلایا جائے گا؟ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

« نَعَمْ، وَأَرْجُو أَنْ تَكُونَ مِنْهُمْ ».

"ہاں، اور مجھے امید ہے کہ ابوبکر تم ان ہی میں سے ہوگے"۔

[صحیح البخاری]

حضرت صدیق اکبر بے شمار فضائل و مناقب کے حامل تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا حال یہ تھا کہ اتنی کثرت سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں روتے اور آنسو بہاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو ان کے حال پہ ترس آتا تھا، کبھی کبھی یہ فرماتے تھے: "کاش میں کوئی درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا"۔ کبھی کبھی کسی پرندے کو دیکھتے تو کہتے: "کاش میں کوئی پرندہ ہی ہوتا، پھر پرندے کو مخاطب کر کے کہتے: تو کتنے مزے میں ہے، جہاں پانی ملتا

ہے وہاں اتر کر پانی پیتا ہے، درختوں کے پتے کھاتا ہے، پھر نہ کوئی حساب وکتاب ہے نہ کوئی سزا اور عقاب"۔

جب وفات ہوئی تو ان کے ترکے میں ان کا کپڑا ملا، ایک سواری کا خچر اور تھوڑا سا مال ملا، حالاں کہ اپنے وقت کے بڑے تاجر تھے، لیکن سارا مال اللہ کے راستے میں خرچ کر دیا۔

لہٰذا ولی، حقیقت میں وہ ہے جس کے دل میں خوف خدا ہو، تقویٰ اور پرہیزگاری ہو، نیک اعمال سے اس کا وقت معمور ہو اور ایمان سے دل منور ہو۔

اولیائے کرام کی تین قسمیں

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اولیاء اللہ کی تین قسمیں ذکر فرمائی ہیں، انہوں نے یہ تین قسمیں قرآنِ کریم کی سورۂ فاطر کی ایک آیت سے مستنبط کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا ٱلْكِتَٰبَ ٱلَّذِينَ ٱصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۖ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِۦ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِٱلْخَيْرَٰتِ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَضْلُ ٱلْكَبِيرُ ﴿٣٢﴾ ﴾ [فاطر : ۳۲]

"پھر ہم نے اس کتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو بنایا جنھیں ہم نے چن لیا تھا، پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں، اور ان ہی میں سے کچھ ایسے ہیں جو درمیانے درجے کے ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں بڑھے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ (اللہ کا) بڑا فضل ہے"۔ [سورۂ فاطر:۳۲]

پہلی قسم ہے: «ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ» اپنے نفس پر ظلم کرنے والا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی کبیرہ گناہوں کا بھی ارتکاب کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی واجبات کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔

دوسری قسم ہے: «مُقْتَصِد» یہ درمیانے درجے کا ہے جو واجبات کا پورا اہتمام کرتا ہے، اور کبیرہ گناہوں سے بھی بچتا ہے، لیکن کبھی کبھی مستحبات کو چھوڑ دیتا ہے اور مکروہات کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

تیسری قسم ہے: «سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ» یہ وہ ولی کامل ہے جو فرائض وواجبات اور مستحبات کا اہتمام کرتا ہے، اور کبیرہ گناہ، حرام کاری اور مکروہات سے اجتناب کرتا ہے۔ اس کے حوالے سے علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ وہ ولی ہے جو جب سوتا ہے تو اس کا دل عرش کے ارد گرد طواف کر رہا ہوتا ہے، وہ دل اپنے ربّ ذوالجلال کے ساتھ ہر وقت معلق رہتا ہے، جب یہ سوتا ہے اور آدھی رات گزر جاتی ہے تو اٹھ کھڑا ہوتا ہے، وضو کرتا ہے اور نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر نماز و مناجات میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اللہ کے دوست سے عداوت کا برا انجام اور نفلی عبادات کا مقام

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي

بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ؛ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ». [صحيح البخاري]

”جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اسے میری طرف سے جنگ کا اعلان ہے، اور میرا بندہ جن جن عبادتوں سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں کوئی بھی عبادت اس سے زیادہ مجھے پسند نہیں ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔(فرائض کی ادائیگی کے بعد) میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، پھر جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور عنایت کرتا ہوں، اور اگر وہ کسی چیز سے پناہ مانگتا ہے تو اسے ضرور پناہ دیتا ہوں، اور مجھے کسی کام میں اتنا تردد نہیں ہوتا، جتنا کسی مومن بندے کی روح قبض کرنے میں ہوتا ہے، وہ تو موت کو (تکلیف کی وجہ سے) ناپسند کرتا ہے اور میں بھی اس کی تکلیف کو ناپسند کرتا ہوں“۔[بخاری شریف]

جو واقعی اللہ کے ولی ہیں، اللہ سے محبت کرتے ہیں، اس کے احکام پر مرتے مٹتے اور جان دینے کے لیے تیار رہتے ہیں، یقیناً اللہ بھی ایسے لوگوں سے محبت فرماتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص اللہ کے محبوب بندوں سے دشمنی کرے گا، ان کا مذاق اڑائے گا، ان کی عزت وآبرو پہ حملہ کرے گا اور ان کی غیبت کرے گا تو اس محبت کے تقاضے کی بنا پر اللہ

تعالیٰ کی ناراضگی یقینی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔

«فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ» کے جملے میں جو قوت ہے، جو تہدید اور وعید ہے، اس کے استحضار سے رونگٹے کھڑے ہوجانے چاہییں، بلکہ دل کانپ جانا چاہیے، وہ کون شخص ہے جو اللہ رب العزت والجلال سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوگا، کسے یہ یارا ہے کہ وہ اس اعلانِ جنگ کو قبول کرے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو لوگ ''اولیاء اللہ'' کو اذیت پہنچاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت، اس کے عقاب اور اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔

اس حدیث پاک میں نوافل کو قرب الٰہی میں ترقی کا ذریعہ بتایا گیا ہے، جب کہ اسی حدیث کے آغاز میں قربِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ فرائض کو بتایا گیا ہے، اس لیے کہ اغلب یہی ہے کہ نوافل کا اہتمام وہی کرے گا جو فرائض ادا کرچکا ہو، اور یہی نوافل قربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں، ورنہ فرائض کو نظر انداز کرکے نفلوں کا اہتمام جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

ان نوافل سے مراد نفلی نمازیں بھی ہیں، یعنی فرائض کے علاوہ جتنی نفلی نمازیں ہیں خواہ وہ مؤکدہ ہوں یا غیر مؤکدہ ہوں، اسی طرح فرض روزوں کے علاوہ جتنے نفلی روزے ہیں، فرض حج کے علاوہ جتنے نفلی حج ہیں اور فرض زکات وصدقات کے علاوہ جتنے نفلی صدقات ہیں وہ سب ان نوافل میں شامل ہیں۔

ولایت اور دعاؤں کی قبولیت

فرائض وواجبات کی پابندی کے ساتھ جو شخص کثرت سے نوافل کا اہتمام کرکے اللہ پاک کا قرب، اس کی دوستی اور ولایت کو پالیتا ہے اور اس کا محبوب بن جاتا ہے تو پھر اس کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اور چلنا پھرنا سب اللہ کی مرضی کے مطابق ہوجاتا ہے، اس کے تمام

اعضاء اللہ کی رضا کے موافق اپنا کام کرتے ہیں، اسی وجہ سے حرام تو بہت دور کی بات ہے، وہ شکوک و شبہات والی چیزوں سے بھی بچتا ہے، چناں چہ وہ اپنے تقوے اور محبت الٰہی کی وجہ سے ایسا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے تو وہ عنایت کرتا ہے، اور جب کسی چیز سے اس کی پناہ مانگتا ہے تو پناہ دیتا ہے، یعنی وہ ''مستجاب الدعوات'' ہوجاتا ہے۔

قبولیتِ دعا کی ایک مثال

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کی پھوپھی حضرت رُبَیّع بنت النَّضر سے ایک بچی کا دانت ٹوٹ گیا، تو انہوں نے بچی کے گھر والوں سے درخواست کی کہ غلطی ہوگئی ہے، آپ معاف کردیں، تو انہوں نے انکار کردیا، پھر یہ درخواست کی کہ کچھ معاوضہ لے لیں اور رفع دفع کرلیں، انہوں نے اس پیش کش کو بھی مسترد کردیا، پھر یہ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہوے اور انہوں نے قصاص کا مطالبہ کیا، یعنی یہ کہ اس ایک دانت کے بدلے میں ان کا دانت بھی توڑ دیا جائے، چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کا فیصلہ سنادیا۔ یہ سن کر حضرت انس بن النضر نے کہا: کیا رُبَیّع کا دانت توڑا جائے گا، جی نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اس کا دانت نہیں توڑا جاسکتا۔ ان کی بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انس! یہ کتاب اللہ کا حکم ہے کہ قصاص لیا جائے''۔ اس کے بعد اس بچی کے جو اہل خانہ اور اولیاء تھے ان کی رائے بدل گئی اور معافی کا اعلان کردیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ».

[صحيح البخاري]

"اللہ کے بعض ایسے بندے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر کسی چیز کی قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیں"۔[بخاری شریف]

قبولیتِ دعاء کا دوسرا واقعہ

ابونعیم نے اپنی سند سے ذکر کیا ہے کہ جنگ اُحد کے موقع پہ حضرت عبد اللہ بن جحش نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر یہ دعا کی کہ یااللہ! کل کو میدانِ جنگ میں میرا ایک ایسے طاقتور شخص سے مقابلہ کرادے جو سخت وار کرنے والا ہو، میں تیری رضا کے لیے اس سے لڑوں اور وہ مجھ سے لڑے، پھر وہ مجھے مار کر میری ناک اور میرے کان کاٹ لے، اور کل جب میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں تو، تو مجھ سے پوچھے، اے عبد اللہ! تیری ناک اور تیرے کان کیوں کاٹے گئے؟ تو میں عرض کروں، یااللہ تیری رضا کی خاطر اور تیرے رسول کی رضا کی خاطر کاٹے گئے، تو اس کے جواب میں تو کہے: تو نے سچ کہا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ دن کے آخری پہر میں، میں نے دیکھا کہ ان کی ناک اور ان کے کان ایک دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔

اس واقعہ میں ایک طرف واضح طور پر دعا کی قبولیت نظر آرہی ہے، دوسری طرف عبداللہ بن جحش کی دعا کا مضمون ہے جس سے ان کا جنت کا شوق اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا کے لیے جانِ عزیز کو قربان کرنے کا بھرپور اور مخلصانہ جذبہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

یہ تھے اللہ تعالیٰ کے سچے ولی، اللہ تعالیٰ کے حقیقی دوست جنہوں نے اپنی دوستی کی ایسی قیمت ادا کی جس سے بڑی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی، ایسی قربانی دی جس سے عظیم کوئی قربانی نہیں ہوسکتی۔

سچے ولی کی پہچان

یہ کیسے معلوم ہوگا کہ سچا اور حقیقی ولیُ اللہ کون ہے؟ اس کے لیے شریعت نے متعدّد علامتیں مقرر کی ہیں، جن سے ولی کی پہچان ہوسکتی ہے۔ نرے کشف وکرامات سے کسی کی ولایت کی گواہی نہیں دی جاسکتی، کوئی شخص ہوا میں اڑ رہا ہو یا پانی پر چل رہا ہو یا آگ سے کھیل رہا ہو تو یہ اس کے ولی ہونے کی علامت نہیں ہوسکتی جب تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی پاکیزہ شریعت کی اتباع نہ کرے، اگر شریعت کے خلاف کوئی زندگی گزارے تو ہزار کرتبوں کے باوجود شریعت اسے ولی نہیں سمجھتی۔

(۱) اس ضمن میں سب سے بنیادی شے عقیدے کی درستگی ہے، کیوں کہ عقیدہ وہ بنیاد ہے جس پر شریعت اسلامیہ کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے، لہٰذا اگر بنیاد میں جھول ہو، یا خرابی ہو یا کمزوری ہو تو بلاشبہ مضبوط عمارت قائم نہیں ہوسکے گی اور عقیدے کی درستگی میں اولین اعتقاد توحیدِ خالص کا اعتقاد ہے، ایسا عقیدۂ توحید جو ہر طرح کے شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر سے پاک ہو۔

(۲) دوسری چیز فرائض کا اہتمام ہے، جن میں سرفہرست نماز ہے، اگر کسی شخص کا ایک لمحہ بھی ذکر کے بغیر نہ گزر رہا ہو، لیکن فرائض کی پابندی نہ کرے تو وہ ولی نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل فلاح اور اہل جنت کے اوصاف میں ذکر فرمایا ہے:

﴿ وَٱلَّذِينَ هُمۡ عَلَىٰ صَلَوَٰتِهِمۡ يُحَافِظُونَ ﴿٩﴾ ﴾ [المعارج: ٣٤]

"اور جو اپنی نماز کی پوری پوری حفاظت کرنے والے ہیں" (یعنی نمازوں کو پابندی سے وقت پر ادا کرتے ہیں)۔ [سورۂ معارج:۳۴]

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو نیزہ مارا گیا تھا، سکرات الموت میں تھے، ان کی آنکھیں اشک بار تھیں، صبح کا وقت ہوا تو انہیں نماز یاد دلائی گئی تو فرمایا:

«نَعَمْ، وَلَا حَظَّ فِي الإِسْلَامِ لِمَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ».

[رواه الإمام في الموطأ]

"ہاں، اس شخص کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں جو نماز چھوڑ دے"۔ [موطا]

حضرت عمرؓ اپنی حکومت کے ذمہ داران کو خط لکھتے تھے اور انہیں نماز کی پر زور تاکید فرماتے تھے، اس خط کے مضمون میں سب سے اہم وصیت یہ ہوتی تھی:

«إِنَّ أَهَمَّ أَمْرِكُمْ عِنْدِي الصَّلَاةُ مَنْ حَفِظَهَا، وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِينَهُ، وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ»

[رواه مالك في الموطأ]

"میرے نزدیک تمہاری سب سے اہم چیز نماز ہے، جس شخص نے اس کی نگہ داشت کی اور اس کی پابندی کی، اس نے اپنے دین کی حفاظت کرلی، اور جس نے اس کو ضائع کر دیا تو وہ شخص اس کے علاوہ دوسرے اعمال کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا"۔ [موطا]

اس کی اہمیت کے پیش نظر رسول اکرم ﷺ نے اپنی وفات سے قبل جو آخری وصیت اس امت کو فرمائی وہ نماز کے سلسلے میں اللہ سے ڈرنے کی تھی اسی طرح اپنے

غلاموں اور ماتحتوں کے سلسلے میں بھی۔

(۳) اولیاء اللہ کی ایک اہم علامت یہ بھی ہے کہ ان کی توجہ اپنے ظاہر سے زیادہ باطن پہ ہوتی ہے، جسم سے زیادہ دل کا خیال رکھتے ہیں، اس کو اس کی تمام بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں، اسے شکوک وشبہات اور ناجائز شہوات سے بچانے کی ہمہ وقت کوشش کرتے رہتے ہیں، کیوں کہ قیامت کے روز نہ تو مال وزر فائدہ دیں گے نہ ہی اہل وعیال، البتہ "قلب سلیم" ضرور نفع بخش ہوگا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى ٱللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٩﴾﴾ [الشعراء: ۸۸ – ۸۹]

"جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، ہاں جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس 'قلب سلیم' (سلامتی والا دل) لے کر آئے گا۔ (اس کو نجات ملے گی"۔[سورۂ شعراء:۸۸]

قلب سلیم، وہ قلب ہے جو محفوظ ہو شکوک وشبہات کی بیماریوں سے، جو محفوظ ہو شہوات، نفاق، ریاء، کبر وگھمنڈ، عُجب (خود پسندی) کینہ وبغض اور حسد وغیرہ جیسے مہلک امراض سے — اس قلب میں توحید خالص ہو، اللہ کی عظمت وکبریائی ہو، اخلاص ہو، صداقت وامانت ہو، حسنِ ظن اور دوسروں کے لیے بھلائی کا جذبۂ بے کراں ہو، توکل ہو، صبر وشکر ہو اور خشیت الٰہی ہو۔

(۴) اولیائے کرام کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر اللہ یاد آجائے، ان کی صحبت میں بیٹھ کر محبت الٰہی میں ترقی ہو، دنیا کی محبت میں کمی ہو، نیک عمل کا جذبہ پیدا ہو، گناہوں سے توبہ کی توفیق ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

دریافت کیا گیا:

«يَا رَسُولَ اللهِ! مَنْ أَوْلِيَاءُ اللهِ؟ قَالَ: «الَّذِينَ إِذَا رُؤُوْا ذُكِرَ اللهُ». [رواه الترمذي في نوادر الأصول، والبزار وابن المنذر...]

''یارسول اللہ! اولیاء اللہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: جب انھیں دیکھا جائے تو اللہ کی یاد آجائے''۔ [البزار، وابن المنذر، والترمذی فی نوادر الاصول...]

(۵) اولیاء اللہ کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ اپنی زبانوں کی حفاظت کرتے ہیں، لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، کسی کو اپنی زبان سے اذیت نہیں پہنچاتے، کسی کی غیبت اور چغلی سے اپنی زبانیں خراب کرکے اپنے نیک اعمال برباد نہیں کرتے، انہیں ہمیشہ اس بات کا استحضار اور دھیان رہتا ہے کہ جو بات بھی زبان سے نکلے گی اسے فرشتے ''رقیب عتید'' ضرور لکھیں گے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''اس کو روکے رکھو، تو انہوں نے حیرت سے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! کیا ہم جو کچھ بولتے ہیں اس پر بھی ہم سے باز پرس ہوگی؟ اس پر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: معاذ تیرا بھلا ہو؛ لوگ زبانوں کی ہی بڑبڑ (بے جا استعمال) کی وجہ سے منہ کے بل یا ناک کے بل جہنم میں ڈالے جائیں گے''۔

[ترمذی شریف]

(۶) اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اللہ کے خوف سے اپنی نظر اور سماعت (کان) کی ہمیشہ نگہ داشت رکھتے ہیں، نہ تو ناجائز چیزیں سنتے ہیں، نہ ہی دیکھتے ہیں، دل بہلانے کے لیے موسیقی یا گانے باجے کا سہارا نہیں لیتے۔ اسی طرح نامحرم پر نگاہ ڈالنے سے بھی بچتے ہیں، ایسی تصویروں اور فلموں سے اپنی نگاہیں محفوظ رکھتے ہیں

جن سے ہر طرح کی روحانی ترقی رک جاتی ہے، بلکہ کیے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے اور روحانیت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

نگاہ کو ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر کہا گیا ہے، جو شخص اپنی نگاہ کی حفاظت کرتا ہے استطاعت کے باوجود بدنظری سے بچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سینے میں ایمان کی ٹھنڈک اور حلاوت القا فرماتے ہیں جسے وہ واضح طور پر محسوس کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اولیائے کرام حقوق اللہ اور حقوق العباد، دونوں کی ادائیگی میں پیش پیش رہتے ہیں اور دونوں میں توازن برقرار رکھتے ہیں۔

❊ ❊ ❊

۲۸/رجب/۱۴۳۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سکونِ دل کا راز

لوگوں کی کوششوں اور محنتوں کے مختلف محور ہوتے ہیں، اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے لوگ شب و روز ایک کیے دیتے ہیں، قرآنِ کریم کی زبان میں:

﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴿٤﴾﴾ [الليل: ٤]

''یقیناً تمہاری کوشش مختلف ہے''۔ [سورۂ لیل: ۴]

چناں چہ کوئی قوت و طاقت کے حصول میں لگا ہوا ہے، کوئی جاہ و منصب کی تلاش میں ہے، کوئی شہرت کا بھوکا ہے، کوئی مال و دولت کی جستجو میں سرگرداں ہے، کوئی صحت و تندرستی حاصل کرنے یا اس کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا سارا سرمایہ خرچ کر رہا ہے۔

﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٣٣﴾﴾ [الأنبياء: ٣٣]

''سب اپنے مدار میں تیر رہے ہیں''۔ [سورۂ انبیاء: ۳۳]

ان کے علاوہ بھی آرام و راحت کے دیگر اسباب کو حاصل کرنے کے لیے لوگ قربانیاں دیتے ہیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر لیں، معاشرے میں انہیں سرفرازی بھی

نصیب ہوجائے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں؛ لیکن یہ تمام اسباب اکٹھے ہوکر بھی جو نعمت مہیا نہیں کرسکتے وہ "سکونِ دل" کی نعمت ہے، کیوں کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص طاقتور ہو، سرمایہ دار ہو، تندرست ہو اور اونچے عہدے پر بھی فائز ہو، لیکن سکونِ دل، اطمینانِ قلب اور راحتِ ضمیر سے محروم ہو۔

سکونِ دل کا صرف ایک بنیادی سرچشمہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ سکونِ دل کا سرچشمہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے "ایمان"، اللہ تعالی کی ذات پاک، آخرت اور انبیاء ورسل اور خاص طور سے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر ایسا ایمانِ کامل جس میں شک ونفاق کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو، اللہ کی ذات پر ایسا ایمان، جس میں شرک کی ذرہ برابر بو بھی نہ آئے۔ پھر جس قدر بندہ اپنے خالق ومالک سے قریب ہوتا چلا جائے گا، دل کے سکون سے مزید مالا مال ہوتا جائے گا۔ جب سکونِ دل، راحتِ نفس اور اطمینانِ قلب حاصل ہوجائے تو پھر متاعِ دنیا اور اسبابِ راحت کی کمی اس کے سکونِ دل پر اثرانداز نہیں ہوسکتی، بلکہ اسے معمولی سی جھونپڑی میں بھی کشادہ محل سے زیادہ لطف آئے گا۔ لیکن اگر وہ اس نعمت سے محروم ہے تو وسیع ترین محل بھی اسے قید خانہ معلوم ہوگا۔

کیوں کہ جس شخص کو اللہ کی ذاتِ اقدس کا استحضار ہو، اس پر بھرپور توکل ہو، اس کا دل سمندر سے زیادہ وسیع ہوجاتا ہے، اس کی پوری زندگی ایک ایسی ذات سے وابستہ اور مربوط ہوجاتی ہے جس کی وسعتوں کی کوئی انتہا نہیں، زمین وآسمان، عرش وکرسی، دنیا اور آخرت اور ازل وابد (کائنات کی ابتدا وانتہا) یہ سب اس کے احاطۂ علم میں ہے ——

مومن کا سینہ اور سینے کے اندر دھڑکنے والا دل اس وجہ سے بھی بے انتہا کشادہ ہوجاتا ہے کہ ایمان کا نور اس کے دل میں جگمگاتا رہتا ہے، جو تاریکیوں کو دور کرکے ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے اور زندگی کے سربستہ رازوں کو اس کے لیے کھول کر رکھ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَفَمَن شَرَحَ ٱللَّهُ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِۦ﴾

[الزمر: ٢٢]

"کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے پروردگار کی عطا کی ہوئی روشنی میں آچکا ہے" (سنگ دلوں کے برابر ہوسکتا ہے؟)۔

[سورۂ زمر:۲۲]

اس آیت کریمہ کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

«إِذَا دَخَلَ النُّورُ الْقَلْبَ انْفَسَحَ وَانْشَرَحَ» یعنی نورِ ہدایت جب دل میں اترتا ہے تو دل کشادہ ہوجاتا ہے اور اس کی تنگی ختم ہوجاتی ہے۔

پھر صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: «وَمَا عَلَامَةُ ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللهِ؟!» اے اللہ کے رسول! اس کی نشانی کیا ہے؟ تو ارشاد فرمایا:

«الْإِنَابَةُ إِلَى دَارِ الْخُلُودِ، وَالتَّجَافِي عَنْ دَارِ الْغُرُورِ، وَالِاسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُولِهِ» [رواه الترمذي في جامعه]

"ہمیشگی کے گھر (آخرت) کا دھیان بڑھ جائے، دھوکے کے گھر (دنیا) کی رغبت دل سے دور ہونے لگے، اور موت کے آنے سے پہلے پہلے اس کی تیاری کرنے لگے"۔ [ترمذی شریف]

دل کی دو کیفیات

اوپر ذکر کیا گیا کہ جس دل میں ایمان ویقین کا نور داخل ہوتا ہے، وہ دل منوّر ہوکر کشادہ ہوجاتا ہے اوراس کے اندر کی تنگی ختم ہوجاتی ہے، بالکل اس کے برعکس جب اس دل میں شکوک وشبہات اور الحاد ونفاق داخل ہوجاتا ہے تو یہ دل تنگ ہوجاتا ہے اور سُکڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے دل کی فرحت ومسرت ختم ہوجاتی ہے اور دنیا کی تمام نعمتیں مل کر بھی اس کے دل کی تنگی کو دور نہیں کرپاتیں۔ اسی کو قرآنِ کریم نے اپنے بلیغ ترین اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے:

﴿فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ ۖ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجْسَ عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٢٥﴾﴾[الأنعام: ١٢٥]

”غرض جس شخص کو اللہ ہدایت تک پہنچانے کا ارادہ کرلے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جس کو (اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے) گمراہ کرنے کا ارادہ کرلے، اس کے سینے کو تنگ اور اتنا زیادہ تنگ کردیتا ہے کہ (اسے ایمان لانا ایسا مشکل معلوم ہوتا ہے) جیسے اسے زبردستی آسمان پر چڑھنا پڑرہا ہو۔ اسی طرح اللہ (کفر کی) گندگی ان لوگوں پر مسلط کردیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے“۔[سورۂ انعام:۱۲۵]

روزِ اول سے بے ایمان کے لیے "تنگ زندگی" کا فیصلہ

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی بیوی حواء علیہما السلام کو دنیا میں بھیجا، اسی وقت اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ سکونِ دل اور خوش بختی و سعادت مندی صرف ایمان پر منحصر ہے اور بدبختی، بے چینی، بے کلی اور تنگ زندگی، کفر و بے ایمانی کا نتیجہ ہوگی۔ چناں چہ فرمایا:

﴿ قَالَ ٱهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِيعَۢاۖ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوّٞۖ فَإِمَّا يَأۡتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدٗى فَمَنِ ٱتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقَىٰ ﴿١٢٣﴾ وَمَنۡ أَعۡرَضَ عَن ذِكۡرِي فَإِنَّ لَهُۥ مَعِيشَةٗ ضَنكٗا وَنَحۡشُرُهُۥ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ أَعۡمَىٰ ﴿١٢٤﴾ ﴾ [طه: ١٢٣ – ١٢٤]

"... پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے، تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گمراہ ہوگا، اور نہ کسی مشکل میں گرفتار ہوگا۔ اور (ہاں) جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کرکے اٹھائیں گے"۔ [سورۂ طٰہٰ: ۱۲۳-۱۲۴]

لہٰذا جو شخص اللہ سے دور ہوگا، اس کے "صراطِ مستقیم" اور راہِ ہدایت سے منحرف ہوگا اسے سکونِ دل اور راحتِ نفس کی دولت ہرگز نہیں مل سکتی۔

اگر کسی بے ایمان یا نفس پرست اور اللہ کے باغی کی زندگی عیش و عشرت اور ناز و نعمت اور مادّی اسباب راحت سے پر نظر آرہی ہو تو اس کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا نہ ہوں، کیوں کہ بعض دفعہ ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ اور ہوتا ہے، ان کے دل کا حال معلوم کریں تو پتہ چلے گا کہ کس قدر اجڑا ہوا ہے اور اس میں کتنی بے چینی ہے۔ جب انہوں نے سکونِ دل کی دوا لی ہی نہیں تو سکون کیوں کر آئے گا، جسمانی اور مادّی غذاؤں کا اثر جسم پر

ہو سکتا ہے، لیکن دل پر نہیں، سکونِ دل اور خوش گوار زندگی کی غذا دراصل ایمان اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہے، جو اس سے محروم ہو گا وہ سکون سے بھی محروم ہو گا۔

﴿ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ ٱللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ ٱللَّهِ تَطْمَئِنُّ ٱلْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾ ﴾ [الرعد: ٢٨]

”جو لوگ ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو! صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے“۔ [سورۂ رعد:۲۸]

مؤمن، احساسِ تنہائی کی اذیت سے محفوظ

جس شخص کا اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر قوی ایمان ہو گا، اس کے ذکر سے اس کا دل معمور ہو گا اور احکامِ شریعت کا پابند ہو گا، وہ ان شاء اللہ ”نفسیاتی مریض“ نہیں ہو گا، کیوں کہ عام طور پر اس مرض کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایمان واعمال کی دولت سے محروم ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مرض کی بنیاد احساسِ تنہائی ہے، پریشان کن اور اذیت ناک تنہائی انسان کو ”مریض نفسی“ بنادی دیتی ہے، وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کے سارے دروازے اس کے لیے بند ہو چکے ہیں، تنہائی اس کے لیے ناگن سانپ سے بھی زیادہ الم ناک اور خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس، صاحبِ ایمان ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اللہ اس کے ساتھ ہے، وہ ”انیس الذاکرین“ ہے، اس کے ذکر سے اس کی زبان تروتازہ رہتی ہے اور دل آباد رہتا ہے، جب وہ تنہا ہوتا ہے تو احساس ”معیّتِ الٰہی“ اس کی خلوت میں جلوت اور پر بہار

انسیت پیدا کرتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ فَلَا تَهِنُوا۟ وَتَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱلسَّلْمِ وَأَنتُمُ ٱلْأَعْلَوْنَ وَٱللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَٰلَكُمْ ﴿٣٥﴾ ﴾ [محمد: ٣٥]

"لہٰذا تم کمزور پڑ کر صلح کی دعوت نہ دو، تم ہی سر بلند رہو گے، اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور وہ تمہارے اعمال کو ہرگز برباد نہیں کرے گا"۔

[سورۂ محمد:۳۵]

جس شخص کا دل "معیّتِ ربانی" کی انسیت سے آباد ہو وہ خلوت کی اذیت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا، حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ، وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِيْ».

[صحيح البخاري]

"میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں (یعنی اس کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں) اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے"۔ [بخاری شریف]

وہ شخص کیسے تنہائی کی اذیت محسوس کرے گا جو یہ سمجھتا ہو کہ اس کے رب کی نگاہِ کرم اس کے اوپر سایہ فگن ہے، وہ اس کی خصوصی عنایت کے آغوش میں ہے۔

﴿ وَٱصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ [الطور: ٤٨]

"اور تم اپنے پروردگار کے حکم پر جمے رہو، کیوں کہ تم ہماری نگاہ میں ہو..."۔ [سورۂ طور:۴۸]

شریعت کا علم اور خصوصیت کے ساتھ قرآنِ پاک کا علم، انسان کی خلوت میں تسلی کا سامان فراہم کرتا ہے، جو شخص قرآنِ کریم کی تلاوت تدبرِ معانی کے ساتھ کرے گا، اسے نہ

تو تنہائی سے وحشت ہوگی نہ ہی نفسیاتی بیماری کا شکار ہوگا۔ ذیل کے مبارک اور روح پرور قرآنی کلمات کو پڑھیے اور ان کے معانی پر بھی غور فرمائیے:

﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ﴾

[البقرة: ١١٥]

"اور تم جہاں کہیں ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور جو کام بھی تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھتا ہے"۔ [سورۂ بقرہ:۱۱۵]

جو دل معیّتِ الٰہی کے نور سے روشن ہوگا، اسے تاریک ترین رات میں بھی کسی قندیل کی ضرورت نہیں ہوگی، جس کا باطن یادِ الٰہی سے آباد ہوگا، اسے نہ تنہائی ستائے گی نہ کسی غم گسار کی ضرورت ہوگی۔

إِنَّ قَلْبًا أَنْتَ سَاكِنُهُ غَيْرُ مُحتَاجٍ إِلَى السُّرجِ

"جس دل میں آپ اتر جائیں، اس دل کو چراغوں کی ہرگز ضرورت نہیں"۔

اجتماعیّت کا احساس اور سکونِ دل

ایک مومن کے لیے جو چیزیں باعثِ تسکین اور اطمینانِ قلب ہیں ان میں سے ایک چیز "وحدتِ امّت" کا احساس ہے، چوں کہ سارے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، اس لیے یہ احساسِ اخوّت اور احساسِ اجتماعیّت بھی اس کو معنوی قوّت اور سکونِ دل فراہم کرتا ہے، اس کے تمام اسلامی بھائی اس کے قلب و دماغ میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، اسی لیے جب وہ نماز جیسی اہم عبادت ادا کر رہا ہوتا ہے تو اس میں اپنے رب کی بارگاہ میں جو فریاد پیش کرتا ہے وہ صرف اپنی ذات کی طرف سے نہیں، بلکہ پوری امت کی طرف سے:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝٥﴾ ''اے اللہ! ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں''۔

جب دعا کرتا ہے تو

﴿ ٱهْدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلْمُسْتَقِيمَ ۝٦ ﴾ ''کہتا ہے، یعنی اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا''۔

تشہد میں جب سلامتی کی دعا کرتا ہے تو اپنے ساتھ ساتھ نیک بندوں کو بھی شامل کرتا ہے:

«السَّلامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ»

''سلامتی ہو ہمارے اوپر اور اللہ کے نیک بندوں کے اوپر''۔

بلکہ وہ جب دعا کرتا ہے تو اس قدر فراخ دلی کا مظاہرہ کرتا ہے کہ اپنے عہد کے بھائیوں کے ساتھ عہد ماضی کے ان تمام بھائیوں کو بھی یاد کرتا ہے جن کو رخصت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں:

﴿رَبَّنَا ٱغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلْإِيمَـٰنِ ﴾

[الحشر: ١٠]

''اے ہمارے پروردگار! ہماری بھی مغفرت فرمائیے اور ہمارے اُن بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں''۔[سورۂ حشر:۱۰]

اس سعادت وسکینت کا تعلق نہ تو مال داری اور ناداری سے ہے، نہ رنگ ونسل اور حسب ونسب سے ہے، اس کا تعلق دراصل ایمان اور ایمان کے تقاضوں پہ عمل سے ہے، لہٰذا جس قدر ایمان قوی ہوگا اور اللہ رب العزت سے محبت ہوگی، اسی قدر بندے کو معنوی سعادت وطمانینت نصیب ہوگی، یہ سکونِ دل کی نعمت حقیقت میں آسمانی رحمت کا وہ جھونکا

ہے جس کے مستحق صرف وہی دل بنتے ہیں جن میں ایمان ویقین کی حرارت ہوتی ہے۔ یہ اہل ایمان اور اہلِ دل ایسے ہوتے ہیں کہ جب بے چینی کی وجہ سے لوگوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں اس وقت یہ ثابت قدم رہتے ہیں، جب لوگ غم وغصے سے بھڑک رہے ہوتے ہیں، اس وقت یہ مسکرا کر حالات کا مقابلہ کرتے ہیں، جب لوگ شکوک وشبہات کا شکار ہوتے ہیں تو یہ ایمانی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں، جب لوگ گھبرا کر بے صبرے بن جاتے ہیں تو یہ اس وقت بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور جب لوگ جذبات میں آکر نامعقول حرکت کر رہے ہوتے ہیں اس وقت یہ لوگ نہایت بردباری اور ہوش مندی کے ساتھ دانشمندانہ اقدام کرتے ہیں۔

ہجرت کی مشکل گھڑی میں سکینت کا نزول

یہی وہ مبارک سکینت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پہ ہجرت کی مشکل ترین اور سخت ترین گھڑی میں نازل فرمائی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجودے کہ چاروں طرف سے دشمن آپ کی تاک میں لگے ہوے تھے اور آپ سے انتقام کے لیے گھات میں لگے ہوے تھے، بلکہ آپ کے قریب تک پہنچ گئے تھے؛ لیکن آپ خوف زدہ نہ ہوے نہ پریشان اور رنجیدہ ہوے بلکہ آپ کا دل، احساسِ ”معیّت“ سے پوری طرح مطمئن تھا، یہی وجہ تھی کہ جب آپؐ کے رفیق غار حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ دشمن خدانخواستہ آپؐ تک پہنچ گئے تو پھر نتیجہ کیا ہوگا، انہیں اس حال میں بھی اپنی ذات کی فکر نہ تھی، بلکہ یہ فکر تھی کہ رسول اللہ اور آپ کے پیغمبرانہ مشن کا کیا ہوگا، چناں چہ انہوں نے غار کے اندر سے دشمنوں کے قدم دیکھے اور حضورؐ سے عرض کیا: یا

رسول اللہ! اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدم کے نیچے کی طرف دیکھا تو وہ بلاشبہ ہمیں دیکھ لے گا، یہ سن کر آپؐ نے پیغمبرانہ شان کے ساتھ نہایت اطمینان بھرے لہجے میں فرمایا:

«يَا أَبَا بَكْرٍ، مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ الله ثَالِثُهُمَا». [رواه الترمذي]

”ابوبکر! ان دو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے“۔

[ترمذی شریف]

اسی واقعے کو قرآنِ مقدس نے اپنے بلیغ اور مؤثر انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

﴿إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ ٱللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ثَانِيَ ٱثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِى ٱلْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَـٰحِبِهِۦ لَا تَحْزَنْ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُۥ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ٱلسُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ ٱللَّهِ هِىَ ٱلْعُلْيَا ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝٤٠﴾[التوبة: ٤٠]

”اگر تم ان کی (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد نہیں کرو گے تو (یاد رکھو) اللہ ان کی مدد کر چکا ہے، جب ان کو کافروں نے ایسے وقت (مکہ سے) نکالا تھا جب وہ دو آدمیوں میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ: غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے، چناں چہ اللہ نے اپنی طرف سے ان پر تسکین نازل فرمائی، اور ان کی ایسے لشکروں سے مدد کی جنہیں تم نے نہیں دیکھا، اور کافروں کی بات پست کردی، اور بلند و بالا اللہ ہی کا کلمہ ہے، اور اللہ ہی غالب ہے حکمت والا ہے“۔[سورۂ توبہ:۴۰]

محبت میں تلخیاں بھی شیریں ہوتی ہیں

جو دل اللہ کی محبت میں سرشار ہو، جس دل کا قبلہ صرف ایک ہو، جس کا مقصد وغایت صرف رضائے الٰہی ہو، اسی کے لیے جینا اور مرنا ہو، تو پھر اسے کسی ناگوار چیز کی پرواہ نہیں ہوتی۔ جس شخص نے اپنے تمام مقاصد کو ایک مقصد میں محصور کر دیا ہو، اس کے پیش نظر رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو، وہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کی تمام تر مصیبتوں کو گلے لگاتے ہوئے، ہر طرح کے ظلم وستم کو سہتے ہوئے اور اپنا ہر قیمتی سرمایہ قربان کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اگر اپنی جان بھی دینی پڑ جائے تو اسے بھی مسکرا کر قربان کر دیتا ہے، تاہم تسکینِ دل سے ایک لمحے کے لیے بھی محروم نہیں ہوتا۔

حضرت خبیب بن زید رضی اللہ عنہ کو کفار مکہ نے بے حد ستایا، ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے، بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت خبیب کو سرعام پھانسی دیدیں، لیکن ان کے چہرے سے ذرا بھی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہو رہی تھی، بلکہ انہوں نے شہادت سے قبل دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی جو مل گئی، پھر انہوں نے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دو رکعت ادا کی اور فرمایا:

"اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم یہ کہو گے کہ یہ موت سے گھبرا گیا ہے تو مزید نمازیں ادا کرتا، اس کے بعد مسکراتے ہوئے، ذیل کے اشعار پڑھتے ہوئے شہادت کا جام نوش فرمالیا:ے

وَلَسْتُ أُبَالِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا ‏ ‏ عَلَى أَيِّ جَنْبٍ كَانَ للهِ مَصْرَعِي

وَذَلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلَـهِ وَإِنْ يَشَأْ ‏ ‏ يُبَارِكْ عَلَى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

"جب میں حالتِ اسلام میں قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ مجھے کس پہلو پر لٹا کر قتل کیا جائے گا۔ اور یہ تو صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اور اگر وہ چاہے گا تو میرے جسم کے پارہ پارہ اعضاء میں برکت عطا فرمائے گا"۔[بخاری شریف]

ان کے یہ الفاظ ان کی تسکین دل کے ترجمان ہیں، یہ اسی ایمان ویقین کا کرشمہ تھا جو ان کے دل میں گھر کر چکا تھا۔

اسی طرح ایک صحابی (حضرت حرام بن ملحانؓ] کو غدار مشرکین نے نیزہ مارا اور نیزہ ان کے جسم میں داخل ہو گیا تو اس وقت انہوں نے جو الفاظ کہے تھے وہ بھی ان کی دلی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں، فرمایا: «فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ» "ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا"۔[بخاری شریف]

غزوۂ احزاب کے موقع پہ مسلمان مجاہدین کے ایمان کا سخت امتحان ہوا، کیوں کہ دشمنوں کا لشکر ہر طرح پھیل گیا تھا، جب مسلمان اوپر دیکھتے تو دشمن کا لشکر، نیچے دیکھتے تو دشمن کا لشکر، آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آنے لگے تھے، منافقین نے بھی اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور کہنے لگے: اللہ اور رسول نے جو ہم سے وعدۂ نصرت کیا تھا وہ دھوکے کے سوا کچھ نہ تھا؛ لیکن جو سچے مسلمان تھے جن کا دل ایمان ویقین اور اللہ ورسول کی محبت سے آباد تھا، انہوں نے پورے اعتماد ووثوق کے ساتھ مؤمنانہ لہجے میں ایسے بلیغ حوصلہ افزا اور ایمان افروز کلمات کہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآنِ مقدس کا جزو بنا دیا۔ سورۂ احزاب کی یہ آیت پڑھیے:

﴿وَلَمَّا رَءَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلْأَحْزَابَ قَالُوا۟ هَٰذَا مَا وَعَدَنَا ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ

وَصَدَقَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّآ إِيمَـٰنًا وَتَسْلِيمًا ﴿٢٢﴾

[الأحزاب: ٢٢]

"اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، جب انہوں نے (دشمن کے) لشکروں کو دیکھا تھا تو انہوں نے یہ کہا تھا: یہ وہی بات ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے کیا تھا، اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا۔ اور اس واقعے نے ان کے ایمان اور تابع داری کے جذبے میں اضافہ کردیا"۔ [سورۂ احزاب: ۲۲]

یہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کی کرشمہ سازی تھی جس نے خوف ناک اور دل دہلانے والے حالات میں بھی ان کے دلوں کو نہ صرف تھامے رکھا بلکہ ان کے ایمان ویقین کی قوت میں اضافہ کردیا اور انہیں چین وسکون اور اطمینانِ قلب نصیب کیا۔

نماز اور تسکینِ دل

ایمان وہ سرچشمۂ سکونِ دل ہے جس کے بغیر اس عظیم نعمت سے بہرہ یابی ممکن نہیں، ایمان کی وجہ سے تسکینِ دل حاصل ہوتا ہے، اگر اس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے تو تسکین میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے، ان ایمانی تقاضوں میں سب سے اہم نماز کی ادائیگی ہے، نماز دراصل روحانی ارتقاء کا زینہ ہے، مومن کی معراج ہے، زمین پہ رہتے ہوئے ایک بندہ اپنی روحانی پرواز سے عرشِ معلیٰ کی سیر کرلیتا ہے، وہ جس وقت نماز کے لیے دست بستہ اپنے خالق ومالک کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے، اس کی تعریف وثنا بیان کرتا ہے، اس سے مناجات کرتا ہے اور دنیا کے سارے مشاغل سے کٹ کر اور کاروبار زندگی سے بالکل ہٹ کر اس طرح خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے گویا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اس یقین

کے ساتھ کہ خدائے ذوالجلال اسے دیکھ رہا ہے، اس کی مناجات سن رہا ہے اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے وقت ہر ایک آیت کا جواب دے رہا ہے —— جب ان کیفیات کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تو اس کے دل میں سکون واطمینان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسْتَعِينُواْ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ ﴿١٥٣﴾ ﴾ [البقرة: ١٥٣]

”اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“۔[سورۂ بقرۃ:۱۵۳]

اسی لیے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی حیران کن یا پریشان کن چیز آتی تو آپ نماز کی طرف متوجہ ہوتے، حضرت بلال کو فرماتے: ”بلال! مجھے نماز کے ذریعے راحت پہنچاؤ“۔[ابوداؤد]

نماز میں آپ کو اتنی راحت ملتی کہ آپ یوں فرماتے: ”میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے“۔[نسائی]

ایمان اور یاد الٰہی، بالخصوص نماز کے ساتھ زندگی گزاریے، زندگی کا حقیقی لطف اٹھائیے، ایسا لطف کہ جس سے دنیا کے مصائب اور رنج وغم کے احساس میں تخفیف ہوگی، بلکہ کانٹوں پہ بھی راحت کی نیند آجائے گی۔ ؎

کتنی تسکین ہے وابستہ تیرے نام کے ساتھ
نیند کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے آرام کے ساتھ

❊ ❊ ❊

٦/صفر/١٤٣٦ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تزکیۂ نفس

صحیح مسلم میں، امام مسلمؒ نے رسول اکرم ﷺ کی یہ دعا ذکر کی ہے:

«اللهُمَّ آتِ نَفْسِي تَقْوَاهَا، وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا».

ترجمہ: ”اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ شعار بنادے، اور اسے پاک فرمادے، تو ہی سب سے بہتر پاک کرنے والا ہے“۔

قرآنِ کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں یہ الفاظ ہیں:

﴿وَمَآ أُبَرِّئُ نَفْسِىٓ ۚ إِنَّ ٱلنَّفْسَ لَأَمَّارَةٌۢ بِٱلسُّوٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىٓ ۚ إِنَّ رَبِّى غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٣﴾﴾ [يوسف: ٥٣]

”اور میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرا نفس پاک صاف ہے، واقعہ یہ ہے کہ نفس تو برائی کی تلقین کرتا ہی رہتا ہے، ہاں میرا رب رحم فرمادے تو بات اور ہے، (کہ اس صورت میں نفس کا داؤ نہیں چلتا) بیشک میرا رب بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے“۔[سورۂ یوسف:۵۳]

نفس کی حفاظت

شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ ہر شخص اپنے نفس کو ہلاکت سے بچائے، دانستہ طور پر خود کو ہلاکت کی راہ پر نہ ڈالے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝٢٩﴾

[النساء: ٢٩]

"اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے"۔[سورۂ نساء:٢٩]

نیز شریعت نے انسان کو یہ حکم دیا کہ اپنے نفس کو حرام اور ناجائز کاموں سے بچائے اور ناجائز طریقے سے اپنی شہوت پوری نہ کرے، کیوں کہ اس کا انجام برا ہے، دنیا میں تباہی اور آخرت میں سخت عذاب اور رسوائی ہے۔

حرام اور ناجائز امور سے نفس کی حفاظت، ایک مُجاہَدہ طلب اور صبر آزما کام ہے، تقویٰ مجاہدہ اور صبر کے ذریعہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا، اسے پاک صاف کرلیا تو وہ شخص کامیاب ہوگیا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّىٰهَا ۝٩﴾ [الشمس: ٩]

ترجمہ: "یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا"۔[سورۂ شمس:٩]

بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بلند درجات اور جنت کے اعلیٰ مقامات کی خوش خبری دی ہے۔

﴿وَمَن يَأْتِهِۦ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَأُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلدَّرَجَٰتُ

ٱلْعُلَىٰ ﴿٧٥﴾ جَنَّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَآءُ مَن تَزَكَّىٰ ﴿٧٦﴾﴾ [طه: ٧٥ – ٧٦]

''اور جو شخص اس کے پاس مومن بن کر آئے گا جس نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے، تو ایسے ہی لوگوں کے لیے بلند درجات ہیں۔ وہ ہمیشہ رہنے والے باغات جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے تزکیۂ نفس کیا (پاکیزگی اختیار کی)''۔[سورۂ طہٰ:۷۵-۷۶]

انبیائے کرام علیہم السلام کا اہم فریضۂ منصبی ''تزکیۂ نفس''

تزکیۂ نفس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیائے کرام کے جو فرائضِ منصبی بیان فرمائے ہیں ان میں تزکیۂ نفس بھی ہے، اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون سے جاکر یہ کہیں:

﴿فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَىٰٓ أَن تَزَكَّىٰ ﴿١٨﴾﴾ [النازعات: ١٨]

ترجمہ: ''اس سے کہو کہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے''۔[سورۂ نازعات:۱۸]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی کا ذکر قرآن کریم نے اس طرح کیا ہے:

﴿هُوَ ٱلَّذِى بَعَثَ فِى ٱلْأُمِّيِّۦنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا۟ مِن قَبْلُ لَفِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٢﴾﴾ [الجمعة: ٢]

''وہی ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے

سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کریں اور ان کو پاکیزہ بنائیں (تزکیۂ نفس کریں) اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں، جب کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوے تھے"۔ [سورۂ جمعہ:۲]

تزکیہ کے معنی

لُغت میں تزکیہ کے معنی ہیں پاکیزہ کرنا اور زیادہ کرنا، لیکن اصطلاح شریعت میں اس سے مراد ہے نفس کی اصلاح کرنا اور اس کو پاکیزہ بنانا، علم نافع اور عمل صالح کے ذریعہ اور شریعت کے اوامر و نواہی کی پاسداری کر کے، یعنی شریعت نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان پہ عمل کر کے اور جن سے بچنے کا حکم دیا ہے ان سے پرہیز کر کے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث پاک میں تزکیۂ نفس کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ انسان کو یہ معرفت حاصل ہو جائے کہ وہ جہاں بھی ہے، اللہ اس کے ساتھ ہے۔

چناں چہ بیہقی اور طبرانی نے روایت نقل کی ہے جس میں حلاوتِ ایمانی کے حصول کے تین اسباب ذکر کیے گئے ہیں: ایک توحیدِ خالص، دوسرے متوسط قسم کے مال سے زکاۃ کی ادائیگی اور تیسرے تزکیۂ نفس۔

جب عرض کیا گیا کہ تزکیۂ نفس کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا:

«أَنْ يَعْلَمَ أَنَّ اللهَ عز وجل مَعَهُ حَيْثُ كَانَ» یعنی بندے کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ وہ جہاں بھی ہوگا، اللہ اس کے ساتھ ہوگا۔

تزکیۂ نفس کے اسباب و عوامل

تزکیۂ نفس یعنی نفس کی پاکیزگی کے حصول کے متعدّد اسباب و عوامل ہیں جنہیں اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) پاکیزگیٔ نفس کا سب سے عظیم اور اہم ذریعہ توحیدِ خالص کا عقیدہ اور اس کے مقتضیات پر عمل پیرا ہونا ہے، اسی لیے توحید کی ضد جو شرک ہے اسے "نجس" اور مشرک کو بھی نجس یعنی ناپاک کہا گیا ہے، اس لیے کہ انہوں نے عقیدۂ توحید کے ذریعہ نفس کی طہارت حاصل نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ [التوبة: ۲۸] "مشرکین تو ناپاک ہیں"۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

توحید، لطیف ترین اور نہایت ہی پاک اور صاف ستھری چیز ہے، اس کے خلاف ذرا سی چیز بھی اس پر اثرانداز ہوجاتی ہے اور پراگندہ کردیتی ہے، اس کی مثال ایک سفید کپڑے کی ہے جس پر ہلکی سی چیز بھی اپنا اثر دکھلاتی ہے، اور اس صاف شفاق آئنہ کی طرح ہے جس پر کوئی ہلکا سا دھبہ بھی فوراً اثرانداز ہوجاتا ہے"۔

(۲) تزکیۂ نفس کے حصول میں نماز کو بڑا دخل ہے، خشوع و خضوع والی نماز کے ذریعہ انسان اپنے گناہوں سے بالکل پاک ہوجاتا ہے۔ چناں چہ حضرت ابوہریرہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

«أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهَرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ، يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ

خَمْسًا، مَا تَقُولُ: ذَلِكَ يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ؟ قَالُوا: لَا يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ شَيْئًا، قَالَ: فَذَلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، يَمْحُو اللهُ بِهَا الْخَطَايَا». [صحيح البخاري]

ترجمہ: ”تم یہ بتاؤ کہ تم میں سے کسی شخص کے دروازے کے پاس کوئی نہر ہو، وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر کوئی میل کچیل رہے گا؟ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: بالکل باقی نہیں رہے گا، تو آپؐ نے فرمایا: یہی مثال ہے پانچوں نمازوں کی، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹادیتے ہیں“۔ [بخاری شریف]

علامہ ابن العربی فرماتے ہیں کہ:

”اس مثال کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کا جسم اور اس کے کپڑے محسوس گندگیوں سے گندے اور ناپاک ہوجاتے ہیں اور انہیں پانی پاک کردیتا ہے، اسی طرح غیر محسوس گناہوں کے ذریعہ جو اس کا باطن گندہ اور ناپاک ہوجاتا ہے تو نمازیں اسے بالکل پاک صاف کردیتی ہیں، یہاں تک کہ کوئی گناہ باقی نہیں رہتا“۔ [فتح الباری]

(۳) تزکیۂ نفس کے حصول کا ایک ذریعہ صدقے کی ادائیگی ہے، صدقے سے مال کی اور مال والے کی تطہیر ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾ [التوبة: ۱۰۳]

ترجمہ: ”(اے پیغمبر!) آپ ان لوگوں کے مال میں سے صدقہ لیجیے جس

کے ذریعہ آپ ان کو پاک کردیں، اور ان کے لیے دعا کیجیے، یقیناً آپ کی دعا ان کے لیے سراپا تسکین ہے"۔[سورۂ توبہ:۱۰۳]

لہٰذا جس طرح پانی سے محسوس گندگی صاف ہوتی ہے اسی طرح صدقے اور زکاۃ سے معنوی گندگی کی صفائی ہوتی ہے۔ اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا الصَّدَقَةُ أَوْسَاخُ النَّاسِ يَغْسِلُونَهَا عَنْهُمْ». [صحيح الترغيب والترهيب]

ترجمہ: "صدقہ، دراصل لوگوں کا میل کچیل ہے جسے وہ اپنے آپ سے دھوتے اور دور کرتے ہیں"۔[الترغیب والترہیب]

چناں چہ حضرت عباسؓ نے جب رسول کریم ﷺ سے یہ درخواست کی کہ انہیں صدقہ وصول کرنے کا ذمہ دار بنادیں تو آپؐ نے فرمایا:

"میں آپ کو لوگوں کے گناہوں کے میل کچیل جمع کرنے کا ذمہ دار نہیں بنانا چاہتا"۔[صحیح ابن خزیمہ]

(۴) حرام چیزوں کو ترک کیے بغیر تزکیۂ نفس کا حصول ممکن نہیں، لیکن حرام اشیاء کو ترک کرنے کے لیے بڑے مجاہدے کی ضرورت پڑتی ہے، بالخصوص جب کسی شخص کو حرام تک رسائی آسانی سے ہو رہی ہو اور وہ اسے صرف خوفِ خدا کی وجہ سے ترک کردے تو اس کی وجہ سے نفس کی پاکیزگی، طہارت اور حیرت انگیز روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ گناہوں کا ارتکاب اور تزکیۂ نفس ایک دوسرے کی ضد ہیں، اگر تزکیۂ نفس مطلوب ہے تو لازمی طور پر گناہوں اور حرام چیزوں کو ترک کرنا ہوگا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا۟ مِنْ أَبْصَـٰرِهِمْ وَيَحْفَظُوا۟ فُرُوجَهُمْ ۚ

ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿٣٠﴾ ﴾ [النور: ٣٠]

ترجمہ: ”مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہی ان کے لیے پاکیزہ ترین طریقہ ہے۔ وہ جو کارروائیاں کرتے ہیں، اللہ ان سے پوری طرح باخبر ہے“۔[سورۂ نور:۳۰]

ظاہری اور باطنی برائی، بے حیائی اور معصیت سے اجتناب دراصل تزکیۂ نفس، صفائیِ باطن اور پاک دامنی کا ضامن ہے، اسی لیے شریعت نے حیاسوز حرکتوں اور اخلاقی انحطاط کو نجاست، خباثت اور گندگی سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی حیاسوز حرکتوں کو ”خبائث“ کہا گیا:

﴿ وَلُوطًا ءَاتَيْنَٰهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَٰهُ مِنَ ٱلْقَرْيَةِ ٱلَّتِى كَانَت تَّعْمَلُ ٱلْخَبَٰٓئِثَ ﴾ [الأنبياء: ٧٤]

”اور لوط (علیہ السلام) کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا، اور انہیں اس بستی سے نجات دی جو گندے کام کرتی تھی“۔[سورۂ انبیاء:۷۴]

حدیث پاک میں بھی گناہوں کو گندگی سے تعبیر کیا گیا ہے، چناں چہ ایک روایت میں ہے:

«مَنْ أَصَابَ مِنْ هَذِهِ الْقَاذُورَاتِ شَيْئًا، فَلْيَسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللهِ». [رواه الإمام مالك في الموطأ]

ترجمہ: ”جو شخص ان گندگیوں میں سے کسی گندگی میں ملوث ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ستاری کی چادر اس پر ڈالی ہے اس میں چھپ جائے“۔

(یعنی اپنے گناہوں کا افشانہ کرے، بلکہ توبہ واستغفار کرے)۔[موطا]

(۵) پاکیزگیٔ نفس کے لیے نفس کا محاسبہ ضروری ہے، کیوں کہ نفس کی پاکیزگی اور اس کی طہارت وصفائی محاسبے پر موقوف ہے، اگر اس کا محاسبہ نہ کیا جائے تو عام طور پر اس کی اصلاح وطہارت نہیں ہوتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل مند انسان کی علامت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے اور موت کے بعد والی زندگی کی تیاری میں لگا رہتا ہے۔

«الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا، وَتَمَنَّى عَلَى اللهِ». [الترمذي]

ترجمہ: ''عقل مند شخص وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے (یعنی آخرت کی تیاری کرے) اور بے وقوف وہ ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرے اور اللہ تعالیٰ پر امیدیں باندھتا رہے''۔

[ترمذی شریف]

لہٰذا جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتا، بلکہ نفس کی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے، نفس کے ہر تقاضے کو پورا کرتا ہے، خواہ وہ حرام ہو یا حلال، جائز ہو یا ناجائز تو یہ شخص شریعت کی نگاہ میں نہایت احمق وعاجز ہے۔ آنکھوں سے حیاسوز مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے، کان سے حرام آوازوں کو اپنے دل ودماغ تک پہنچاتا ہے، حرام غذاؤں سے اپنے جسم کی پرورش کرتا ہے، حرام طریقے سے مال جمع کرتا ہے، اپنی شہوتیں غیر فطری اور ناجائز جگہوں میں پوری کرتا ہے، گویا کہ نفس کو کھلی آزادی دے کر، آخرت کے حساب وکتاب

سے بے فکر ہوکر ایسی آوارگی کی زندگی بسر کرتا ہے جیسے اسے ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہو، موت سے اس نے سمجھوتہ کرر کھا ہو، تو یقیناً ایسا شخص ناعاقبت اندیش اور حد درجے کا بے وقوف کہلائے گا۔ اس کے برعکس وہ شخص جس کے اندر دور اندیشی ہو، آنے والے کل کی اسے فکر ہو، موت کے وقت کی اور اس کے بعد کے مراحل کی فکر دامن گیر ہو، جس کی وجہ سے اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہو، تقاضائے نفس پر گہری بصیرت سے غور کرتا ہو کہ اس پر عمل کرنے سے میرا مالک حقیقی کہیں ناراض تو نہیں ہو گا؟ پھر ہر ناجائز خواہش کو اللہ کی رضا کے لیے ترک کرتا ہو تو ایسے شخص کو تزکیۂ نفس کا وہ اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہو گا جو رضائے الٰہی اور خلد بریں کا اسے مستحق بنائے گا۔

(۶) اہل اللہ، اہلِ صدق ووفا اور عاملین شریعت کی صحبتِ بابرکت اور ان کی مجالس کی شرکت بھی تزکیۂ نفس کے لیے مفید ترین عمل ہے، لہٰذا ان مبارک ہستیوں کی صحبت کو غنیمت سمجھیں اور ان صالحین کی راہ پر چل کر تزکیۂ نفس کی تکمیل کریں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا اور قرآن کریم میں ان انعام یافتہ ہستیوں میں ان کا بھی تذکرہ فرمایا جن کی راہ پر چلنے کی دعا سورۂ فاتحہ میں کی جاتی ہے۔

محاسبۂ نفس کی دو قسمیں

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ:

”محاسبۂ نفس کی دو قسمیں ہیں: ایک عمل سے پہلے، دوسرے عمل کے بعد۔

عمل سے پہلے کا محاسبہ یہ ہے کہ جب کسی کام کا ارادہ ہو تو اس کو عملی جامہ

پہنانے سے پہلے ذرا توقُّف کرے اور جلد بازی نہ کرے، جب یہ واضح ہو جائے کہ اس کام کو کرنا بہتر ہے بنسبت نہ کرنے کے تب عملی قدم اٹھائے۔

دوسری قسم عمل کے بعد محاسبۂ نفس کی ہے، یہ تین طرح کا محاسبہ ہے:

- ایک یہ ہے کہ اپنا محاسبہ یوں کرے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جو حق تھا وہ کما حقہ ادا نہیں کر سکا۔
- دوسرے اپنا محاسبہ اس عمل پر کرے جس کا ترک کرنا زیادہ بہتر تھا بنسبت کرنے کے۔
- تیسرے مباح عمل کے کرنے پر محاسبہ کرے کہ یہ عمل کیوں کیا؟ اس سے مقصود اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کا حصول تھا یا کوئی دنیاوی غرض وغایت تھی؟"۔

دوسروں کی عیب جوئی کے بجائے اپنا محاسبہ کریں

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کے محاسبے کے سلسلے میں بڑا ہی سست اور دوسروں کی عیب جوئی میں بڑا چست واقع ہوا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر خود پسندی، تکبر اور گھمنڈ جیسی باطنی بیماریاں جنم لیتی ہیں، حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ دوسروں کے بجائے اپنی خامیاں، کوتاہیاں اور اندرونی بیماریاں دیکھی جاتیں، جس کا لازمی نتیجہ ہوتا کہ اپنی اصلاح کی فکر ہوتی، دوسروں کی عزت و تکریم ہوتی اور تواضع وانکساری پیدا ہوتی۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

حضرت عمر بن الخطابؓ کا ارشاد ہے:

"انسان کے گنہ گار ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ دوسروں کے ان عیوب پر نظر رکھے جو خود اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں اور ان سے نفرت کرے اُن برائیوں کی وجہ سے جن میں خود بھی مبتلا ہے"۔ [کتاب الزہد لابن المبارکؒ]

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

"اے آدم کی اولاد! تم ایمان کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں پاسکتے جب تک کہ لوگوں کی طرف ان عیوب ونقائص کو منسوب کرنا ترک نہ کردو جو تمہارے اندر بھی موجود ہیں، تمہیں ایمان کی حقیقت تب ہی نصیب ہوگی جب اپنے نفس کا محاسبہ کرکے اس کے عیوب ونقائص کے علاج واصلاح کی فکر میں لگ جاؤگے"۔

آخری بات

نفس امّارہ، انسان کے دل ودماغ میں شکوک وشبہات بھی پیدا کرتا ہے اور بری خواہشات، حرام وناجائز شہوات اور نامناسب احساسات بھی ـــ اس طرح کی صورت حال

سے گھبرانا نہیں چاہیے، بلکہ یہ عین ایمان کی علامت ہے جیسا کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے۔ جس قدر بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے شریعت کی پابندی کرنے لگتا ہے اور گناہوں سے توبہ کرکے ان سے دور بھاگتا ہے، اسی قدر نفس اور شیطان بھی اس کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ "شیطان کا مکروفریب بہت کمزور ہے"، لہٰذا اللہ پر توکل کرکے ان وساوس کو ذہن سے باہر کرنے کی کوشش کریں اور ذیل کی دعا بار بار پڑھیں تو ان شاء اللہ ان سے خلاصی نصیب ہوگی۔

«أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ، آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ، هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ».

***

۱۲/محرم/۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استغفار اور اس کے منافع

استغفار کی توفیق ــــ اللہ کی خاص نعمت

استغفار کے معنی ہیں: بخشش طلب کرنا، اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کرنا، بلکہ بھیک مانگنا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے استغفار، گناہوں پر ندامت اور اپنی ذات اقدس سے تعلق کے راستے ہموار کر دیتے ہیں۔ معصوم صرف انبیائے کرام علیہم السلام ہوتے ہیں، ان کے سوا کوئی معصوم نہیں، ہر ایک سے نیک اور برے ہر طرح کے اعمال صادر ہوتے ہیں، لہٰذا اگر کسی کو اپنے گناہوں پر اور برے اعمال پر ندامت کا احساس ہوجائے، پھر توبہ واستغفار سے انہیں دھوکر دل کو پاک کرنے کی توفیق مل جائے تو اس کا مطلب ہے کہ توفیق الٰہی اور عنایت ربانی کی مینہ اس پر برسنی شروع ہوگئی ہے۔

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دعوتِ مغفرت اور دعوتِ جنت دے رہے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَٱللَّهُ يَدۡعُوٓاْ إِلَى ٱلۡجَنَّةِ وَٱلۡمَغۡفِرَةِ بِإِذۡنِهِۦۖ﴾ [البقرة: ۲۲۱]

ترجمہ: ”اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے“۔ [سورۂ بقرۃ:۲۲۱]

حدیث قدسی میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

«يَا عِبَادِي إِنَّكُمْ تُخْطِئُونَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، فَاسْتَغْفِرُونِي، فَإِنِي أَغْفِرُ لَكُمْ». [رواه مسلم]

”اے میرے بندو! تم رات ودن گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو معاف کردیتا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے بخشش طلب کرو، میں بخش دوں گا“۔ [مسلم شریف]

روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کا سب سے عظیم مسئلہ یہ ہے کہ ان کا دل نغمۂ توحید سے سرشار ہو، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں استغفار کو اس عظیم عقیدے کے ساتھ ذکر فرمایا ہے:

﴿ فَٱعۡلَمۡ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ وَٱسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۢبِكَ وَلِلۡمُؤۡمِنِينَ وَٱلۡمُؤۡمِنَٰتِۗ ﴾ [محمد: ۱۹]

ترجمہ: ”اے پیغمبر! یقین کرلیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، اور اپنے قصور پر بھی بخشش کی دعا مانگتے رہیں اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی بخشش کی بھی“۔ [سورۂ محمد:۱۹]

مسندِ ابویعلیٰ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

«يَقُولُ الشَّيْطَانُ: أَهْلَكْتُ النَّاسَ بِالذُّنُوبِ، وَأَهْلَكُونِي

بِلَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَالِاسْتِغْفَارِ».

"شیطان کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں کے ذریعہ ہلاک کیا اور انہوں نے مجھے لا الہ الا اللہ اور استغفار کے ذریعہ ہلاک کردیا"۔

لہٰذا لا الہ الا اللہ کی کثرت سے اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہیں اور استغفار کی کثرت سے دل کی صفائی اور اصلاح کرتے رہیں۔

گناہوں سے زمین بھر جائے اور آسمان تک پہنچ جائیں تو کیا بخشش ممکن ہے؟

اگر کوئی شخص صدق دل سے، ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طلب گار ہو تو اس کے چھوٹے بڑے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي إِلَّا غَفَرْتُ لَكَ عَلَى مَا كَانَ فِيكَ وَلَا أُبَالِي، يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ، ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أُبَالِي، يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الأَرْضِ خَطَايَا، ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً». [رواه الترمذي]

ترجمہ: "اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعائیں کرتا رہے گا اور مجھ سے امیدیں وابستہ رکھے گا، میں تجھے بخشتا رہوں گا تیرے سارے گناہ، اور مجھے کسی کی پرواہ نہیں — اے آدم کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں، پھر

تو مجھ سے بخشش طلب کرے تو میں تجھے بخش دوں گا اور مجھے کسی کی پرواہ نہ ہوگی —اے آدم کے بیٹے! اگر تو گناہوں سے زمین بھر دے، پھر تو مجھ سے معافی کے لیے ملے اس حال میں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے تو میں تیرے پاس اسی کے بقدر مغفرت لے کر آجاؤں گا" (یعنی تجھے معاف کر دوں گا)۔ [ترمذی شریف]

یہ ہیں ہمارے اور آپ کے بخشش نواز پروردگار، ذرا سی ندامت کی ضرورت ہے، دل کی ندامت کے ساتھ زبان کو حرکت میں لائیں اور اس رحیم وکریم ذات کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ وہ تو دن بھر گناہ کرنے والے کا رات میں ہاتھ پھیلا کر انتظار کرتے ہیں اور رات بھر گناہ کرنے والے کا دن میں ہاتھ پھیلا کر انتظار فرماتے ہیں کہ بندہ اس کی طرف واپس آجائے، اور یہ ندا لگاتے ہیں:

﴿وَتُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٣١﴾﴾ [النور: ٣١]

"اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تمہیں نجات ملے"۔ [سورۂ نور:۳۱]

سعادت مند ہیں وہ لوگ جو اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا رب رحیم وکریم ہے، درگزر کرنے والا اور ندامت کے آنسو بہانے والوں کے آنسوؤں کی قدر کرنے والا اور راہِ حق میں لغزش کھانے والوں کو تھامنے والا ہے، بشرطیکہ مخلص ہوں، ناامید نہ ہوں اور گناہوں پہ اصرار نہ کریں۔ اللہ کی رحمت ومغفرت کی امید انہیں استغفار پر آمادہ کرتی ہے نہ کہ جرأت اور ڈھٹائی پر۔

توبہ اور استغفار کرنے والے یہی وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں جو مقام ”احسان“ کو پالیتے ہیں، خدائے پاک کا ہمہ وقت انہیں دھیان رہتا ہے، اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب اور حساب وکتاب سے خائف رہتے ہیں۔ کتاب اللہ میں ان جیسے لوگوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

﴿ٱلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ إِنَّنَآ ءَامَنَّا فَٱغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿١٦﴾ ٱلصَّٰبِرِينَ وَٱلصَّٰدِقِينَ وَٱلْقَٰنِتِينَ وَٱلْمُنفِقِينَ وَٱلْمُسْتَغْفِرِينَ بِٱلْأَسْحَارِ ﴿١٧﴾﴾

[آل عمران: ١٦ — ١٧]

”یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم آپ پر ایمان لے آئے ہیں۔ آپ ہمارے گناہوں کو بخش دیجیے، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیجیے۔

یہ لوگ بڑے صبر کرنے والے ہیں، سچائی کے خوگر ہیں، عبادت گزار ہیں، (اللہ کی خوشنودی کے لیے) خرچ کرنے والے ہیں، اور سحری کے اوقات میں استغفار کرنے والے ہیں“۔ [سورۂ آل عمران:۱۶-۱۷]

انسان سے گناہ کا سرزد ہونا باعثِ حیرت نہیں

کسی انسان کا کسی گناہ میں مبتلا ہوجانا، یا معصیت کا ارتکاب کر بیٹھنا باعثِ تعجب نہیں، کیوں کہ اس کا نفس امّارہ اسے بدکاریوں پر ہی ابھارتا ہے، اس کا شیطان اس کی تباہی وبربادی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ البتہ جو چیز مؤمن کی شایانِ شان نہیں ہے وہ یہ ہے کہ

وہ کسی گناہ پر اصرار کرے، گناہ پر جما رہے اور مطمئن رہے، معاصی کی تاریکی اور گناہوں کی پرخطر و پرفریب وادیوں میں بھٹکتا پھرے؛ بلکہ اس کے اندر چھپے ہوئے ایمان ویقین اور اسے جھنجھوڑنے والے ضمیر کا تقاضا یہ ہے کہ فوراً توبہ اور استغفار کے ذریعہ گناہوں کی نجاست اور ناپاکی کو دھوڈالے، کیوں کہ اس کے پروردگار نے اپنی بخشش کے دروازے کھول کر اسے آواز دی ہے:

﴿يَٰعِبَادِيَ ٱلَّذِينَ أَسۡرَفُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُواْ مِن رَّحۡمَةِ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَغۡفِرُ ٱلذُّنُوبَ جَمِيعًاۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلۡغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٣﴾﴾

[الزمر: ۵۳]

"اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کر رکھی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقین جانو اللہ سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناوہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ [سورۂ زمر: ۵۳]

پروردگار کی بارانِ بخشش پہ قربان جاؤں

اگر کسی شخص سے دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو بلا تاخیر توبہ واستغفار کرے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل استغفار کا بہترین طریقہ بتلایا ہے جس کے بعد کوئی گناہ باقی نہیں رہ جاتا۔ حضرت ابوبکر صدیق کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

«مَا مِنْ عَبْدٍ يُذْنِبُ ذَنْبًا، فَيُحْسِنُ الطُّهُورَ، ثُمَّ يَقُومُ فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ اللهَ إِلَّا غَفَرَ اللهُ لَهُ». [ابوداود والترمذي]

”کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو گناہ کرے پھر اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز ادا کرے، پھر استغفار کرے تو اللہ اس کے گناہ معاف نہ کردے...“۔

[ابوداود و ترمذی]

البتہ یہ ضروری ہے کہ استغفار کرتے وقت گناہ پہ ندامت ہو اور اسے ترک کرنے کا پختہ عزم بھی ہو — اگر استغفار کرتے وقت ذہن میں یہ ہو کہ جیسے ہی دوبارہ موقع ملا پھر گناہ کر بیٹھے گا تو اس استغفار پر نظر ثانی کرے۔

اسی طرح حضرت صدیق اکبرؓ سے ہی صحیحین کی روایت میں ہے، انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی دعا بتلادیں جسے میں نماز میں پڑھا کروں۔ آپؐ نے انہیں یہ دعا بتلائی:

«اللَّهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ»

”اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا، اور گناہوں کو تیرے سوا کوئی معاف نہیں کرسکتا، لہٰذا اپنے (دریائے) مغفرت سے میری بخشش فرما اور میرے اوپر رحم فرما، کیوں کہ صرف تو ہی غفور رحیم ہے“۔

استغفار کے دنیوی منافع

دنیاوی زندگی میں انسان کے اوپر مصائب وآلام کا آنا اور تنگی یا دشواری اور مشکلات سے دوچار ہونا ایک فطری امر ہے، بعض دفعہ پریشانیوں، آزمائشوں اور سخت ترین

حالات کے شکنجے میں اس طرح جکڑ جاتا ہے کہ ان سے نکلنا اسے محال معلوم ہوتا ہے، یوں لگتا ہے کہ خیر کے سارے دروازے اس کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں بعض لوگ خواب آور گولیاں لیتے ہیں، بعض لوگ نشہ آور چیزیں استعمال کرنے لگتے ہیں، بلکہ بعض لوگ تو مایوسی کی اس سطح پر پہنچ جاتے ہیں کہ خودکشی کر بیٹھتے ہیں؛ لیکن کیا یہی مشکلات کا حل ہے؟ کیا مرجانے سے مصائب کا خاتمہ ہوجاتا ہے؟ یا موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے؟

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ آئے تو کدھر جائیں گے

﴿أَيَحْسَبُ ٱلْإِنسَٰنُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُۥ ﴿٣﴾ بَلَىٰ قَٰدِرِينَ عَلَىٰٓ أَن نُّسَوِّىَ بَنَانَهُۥ ﴿٤﴾﴾ [القيامة: ٣ – ٤]

”کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کریں گے؟ کیوں نہیں؟ جب کہ ہمیں اس پر قدرت ہے کہ اس کی انگلیوں کے پور پور کو ٹھیک ٹھیک بنادیں“۔[سورۂ قیامۃ:۲-۳]

اگر استغفار کی کثرت ہو، جو نہ صرف زبان سے ہو، بلکہ زبان کے ساتھ دلوں کی گہرائی سے ہو، جو دل اللہ کی عظمت، اس کے وعدوں پر یقین اور اس کی آیتوں پر مضبوط ایمان سے آباد ہوں، تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب کے فیصلے کو ٹال دیتے ہیں اور ہر طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں سے نجات دیتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣٣﴾﴾ [الأنفال: ٣٣]

"اور (اے پیغمبر!) اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان کو اس حالت میں عذاب دے جب آپ ان کے درمیان موجود ہوں، اور اللہ اس حالت میں بھی ان کو عذاب دینے والا نہیں ہے جب وہ استغفار کرتے ہوں"۔ [سورۂ انفال:۳۳]

استغفار کی کثرت کی وجہ سے خدائے پاک ذہنی الجھنوں کو دور کرکے پر سکون زندگی عنایت فرماتے ہیں، ہر طرح کی تنگی ہٹا کر کشادگی عطا فرماتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق کا انتظام کر دیتے ہیں کہ بندے کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ لَزِمَ الِاسْتِغْفَارَ، جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجًا، وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ». [ابو داود وابن ماجه وأحمد]

"جو کوئی استغفار کی کثرت کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی میں کشادگی اور ہر رنج سے نجات کی راہ ہموار کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرمائے گا، جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔ [ابوداود، ابن ماجہ، احمد]

جہاں تک ممکن ہو استغفار کی کثرت کریں، کیوں کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عمدہ سامان زندگی، رزق میں وسعت، امن وامان، صحت وعافیت، خوش حالی اور خوش بختی اور قناعت جیسی گراں قدر نعمتوں سے نوازتے ہیں۔

آرزوؤں، تمناؤں اور ضرورتوں کی تکمیل اور مال ودولت اور قوت وطاقت کے حصول کا براہ راست اور گہرا تعلق ہے فرد ومعاشرے کی طہارت وپاکیزگی اور توبہ واستغفار سے۔ زمین کی زرخیزی، نسلوں میں خیر وبرکت، بارانِ رحمت، عزت وکرامت اور زندگی

کی حسین بہاریں استغفار سے وابستہ ہیں۔ سورۂ نوح کی ان آیات کو پڑھیے:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴿١٠﴾ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا ﴿١١﴾ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا ﴿١٢﴾﴾ [نوح: ١٠ – ١٢]

”چناں چہ میں نے کہا کہ: اپنے پروردگار سے مغفرت مانگو، یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لیے باغات پیدا کرے گا، اور تمہاری خاطر نہریں مہیا کردے گا“۔ [سورۂ نوح:۱۰-۱۲]

سورۂ ہود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خطاب پڑھیے جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش فرمایا:

﴿وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾﴾ [هود: ٥٢]

”اے میری قوم! اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تم پر آسمان سے موسلادھار بارشیں برسائے گا، اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا، اور مجرم بن کر منہ نہ موڑو“۔ [سورۂ ہود:۵۲]

اسی طرح ہمارے نبی، سید الانبیاء والمرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کو مخاطب کر کے جن باتوں سے آگاہ کرنے کا حکم قرآن کریم نے دیا ہے، منجملہ ان کے

یہ بھی ہے:

﴿وَأَنِ ٱسۡتَغۡفِرُواْ رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوبُوٓاْ إِلَيۡهِ يُمَتِّعۡكُم مَّتَٰعًا حَسَنًا إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى وَيُؤۡتِ كُلَّ ذِي فَضۡلٖ فَضۡلَهُۥۖ﴾ [هود: ٣]

”اور یہ کہ تم اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تمہیں ایک مقرر وقت تک (زندگی سے) اچھا لطف اٹھانے کا موقع دے گا، اور ہر اس شخص کو جس نے زیادہ عمل کیا ہوگا، اپنی طرف سے زیادہ اجر دے گا“۔ [سورۂ ہود:۳]

استغفار کی وجہ سے طہارتِ قلب، روشن ضمیری، صلاحِ عمل اور تزکیۂ نفس جیسی بیش بہا نعمتوں سے انسان بہرہ مند ہوتا ہے۔

استغفار کس طرح کریں؟

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ:

”شریعت میں وہ استغفار مطلوب ہے جس سے گناہوں پر اصرار کی گرہیں کھل جائیں (یعنی گناہوں پر جمے رہنے کی عادت ختم ہوجائے) اور استغفار کے معانی دل میں راسخ ہوجائیں۔ صرف استغفار کے الفاظ کا زبان پہ ورد رکھنا کافی نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص محض زبان سے استغفار کے الفاظ کہتا رہے اور اس کا دل گناہوں کے ارتکاب پر مصر ہو تو اس کے اس استغفار کو بھی استغفار کی ضرورت ہے“۔

بعض اہل معرفت کہتے ہیں:

”جس شخص کے استغفار کے نتیجے میں تصحیح توبہ نصیب نہ ہو تو وہ جھوٹا ہے، اور جو شخص گناہوں پہ جما رہے، انھیں چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو اور محض زبان سے استغفار کرے تو وہ گویا کہ اپنے رب سے مذاق کر رہا ہے“۔

حقیقی استغفار یہ ہے کہ گناہ چھوڑنے کا سچا پکا عزم ہو اور ندامت کے ساتھ دل کا مالک الملک، علام الغیوب پروردگار کی طرف رجوع ہو۔

نبیِ معصوم، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار

اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو سورۂ نصر میں اور دیگر سورتوں میں بھی استغفار کا حکم فرمایا ہے، چناں چہ آپؐ معصوم عن الخطا ہونے کے باوجود ایک ایک مجلس میں سو سو دفعہ استغفار فرماتے تھے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں:

«إِنْ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَجْلِسِ الْوَاحِدِ مِائَةَ مَرَّةٍ: «رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ، إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ». [رواه أبوداؤد والترمذي]

”ہم ایک مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سو بار کہتے ہوئے شمار کر لیتے تھے: «رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ، إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ» ترجمہ: ”اے میرے رب! مجھے بخش دے، اور میری توبہ قبول کر، تو ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“۔[ابوداؤد والترمذی]

ایک دوسری روایت میں خود رسول اللہ ﷺ اپنے استغفار اور توبہ کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں:

«وَاللهِ إِنِّی لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِی الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً». [صحيح البخاري]

"خدا کی قسم، میں ایک دن میں ستر سے زائد مرتبہ توبہ اور استغفار کرتا ہوں"۔[بخاری شریف]

اللہ کے پیغمبر، ساری انسانیت کے رہبر، علم وعمل کے پیکر رسول اکرمؐ اگر اللہ کی جناب میں کثرت سے استغفار فرمارہے ہیں تو ہم گنہ گاروں کے لیے استغفار کی کیا اہمیت ہونی چاہیے؟ اگر نفس وشیطان کے وسوسے اور تقاضائے بشریت کی بنا پر گناہ ہوجائے تو بلاتردد اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں، ندامت کے آنسو بہائیں، خشیتِ الٰہی کے ساتھ توبہ واستغفار کریں، اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو مٹادیں گے، بلکہ سچی پکی توبہ ہوگی تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے تمام سیئات کو حسنات سے مُبدّل فرمادیں گے۔

سَحر کے وقت کا استغفار

ویسے تو استغفار کے لیے کوئی وقت متعیّن نہیں ہے، کسی وقت بھی استغفار کیا جاسکتا ہے؛ تاہم سَحر کے وقت استغفار کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دو جگہ تعریف فرمائی ہے۔ ایک جگہ سورۂ آل عمران میں: «وَٱلْمُسْتَغْفِرِينَ بِٱلْأَسْحَارِ» فرمایا یعنی آخرت میں اللہ کی نعمتوں کے حق دار لوگوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں۔ دوسری جگہ سورۂ الذاریات میں فرمایا:

﴿كَانُوا۟ قَلِيلًا مِّنَ ٱلَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴿١٧﴾ وَبِٱلْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿١٨﴾﴾ [الذاريات: ١٧ – ١٨]

وہ (تقویٰ شعار جنتی) رات کو بہت کم سویا کرتے تھے اور سحر کے وقت وہ
استغفار کیا کرتے تھے"۔ [سورۂ ذاریات: ۱۷-۱۸]

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ:

"سحر تک تو وہ تہجد کی نمازیں ادا کرتے رہتے ہیں اور سَحر کے وقت بیٹھ کر
استغفار میں مشغول ہو جاتے ہیں"۔

سحر کا وقت در اصل غفلتوں کا وقت ہوتا ہے، لوگ گہری نیند میں پڑے آرام کر رہے ہوتے ہیں، ایسے سنّاٹے میں اللہ سے محبت کرنے والے، اپنے گناہوں پر آنسو بہانے والے، اہل دل اور اہل معرفت، جنہیں آہ سحر گاہی کا چسکا لگ چکا ہوتا ہے وہ محبت الٰہی، ذوقِ عبادت اور فکر آخرت کے جذبے سے سرشار بلکہ دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، نمازیں ادا کرتے ہیں پھر دیر تک استغفار کرتے ہیں۔ اسی طرح کی لذت آشنائی کا ذکر کسی صاحب دل نے یوں کیا تھا کہ:

"بادشاہوں اگر معلوم ہو جائے کہ ہم کتنے مزے میں ہیں تو وہ ہمارے
خلاف لشکر کشی کر بیٹھیں گے"۔

اللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوبُ إِلَيْكَ.

***

۲۲/محرم/۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ظاہری آراستگی اور صفائی ستھرائی

انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا

ہر انسان کی تخلیق دو چیزوں سے ہوئی ہے، ایک روح دوسرے جسم، اسی لیے اسلامی تعلیمات وہدایات انسان کے دونوں قوام سے متعلق ہیں: ظاہر سے بھی اور باطن سے بھی۔

اسلام نے اصلاحِ باطن اور اصلاحِ ظاہر، دونوں پر زور دیا ہے، چناں چہ نماز، روزہ، حج، صبر وشکر، تحمل اور بردباری اور ان سب سے پہلے ایمان ویقین، ان سب کا تعلق اصلاح باطن سے ہے، یہ روح کی غذائیں ہیں جن سے روح کو تقویت ملتی ہے اور وہ پاکیزہ اور صاف ستھری ہوکر ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے—جب کہ جسم کی صفائی ستھرائی، لباس، جوتے، کنگھی، گھر، صحن، سڑک، سواری اور دیگر استعمال کی چیزوں کی صفائی ستھرائی، حسن ترتیب اور حسنِ تنظیم کی وجہ سے جسمانی صحت وعافیت پر ان کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔

وضواور غسل ـــــ ظاہری طہارت کے مظاہر

اسلام میں انسان کے بدن کی تکریم کا حکم ہے، خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، اسی لیے وضو اور غسل کا حکم دیا گیا ہے، دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں اور ہر نماز کے لیے وضو ضروری ہے، اسی طرح اسلام نے پورے جسم کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے غسل کا حکم دیا ہے، بعض صورتوں میں غسل کو واجب قرار دیا، بعض صورتوں میں سنت اور بعض میں مستحب۔ قضائے حاجت کے بعد استنجے کا حکم دیا—ان سارے احکام سے واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام میں بدن کی صفائی ستھرائی اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی صحت وتندرستی کی کتنی اہمیت ہے۔

اگر کسی کو جنابت لاحق ہو جائے تو اس کے لیے تو غسل فرض ہے، اسی طرح جمعے کی نماز کے لیے بھی غسل کی تاکید آئی ہے، چناں چہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ عَلَى كُلِّ مُحْتَلِمٍ، وَسِوَاكٌ، وَيَمَسُّ مِنَ الطِّيبِ مَا قَدَرَ عَلَيْهِ». [مسلم]

"جمعے کے دن غسل کرنا ہر بالغ شخص کے لیے ضروری ہے اور مسواک کرنا بھی اور ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق خوشبو استعمال کرے"۔[مسلم شریف]

ایک دوسری روایت میں ہے:

«إِنَّ هَذَا يَوْمُ عِيدٍ، جَعَلَهُ اللهُ لِلْمُسْلِمِينَ، فَمَنْ جَاءَ إِلَى الْجُمُعَةِ فَلْيَغْتَسِلْ، وَإِنْ كَانَ طِيبٌ فَلْيَمَسَّ مِنْهُ، وَعَلَيْكُمْ بِالسِّوَاكِ». [ابن ماجه]

”یہ عید کا دن ہے جسے اللہ تعالی نے مسلمانوں کے لیے عید کا دن قرار دیا ہے، لہٰذا جو کوئی جمعہ کے لیے آئے تو غسل کرکے آنا چاہیے، اور اگر خوشبو میسر ہو تو لگائے اور تم مسواک ضرور کرو“۔[ابن ماجہ]

وضواور غسل کی وجہ سے مسلمان قیامت کے روز بھی روشن جبیں

وضواور غسل کی وجہ سے انسان کے ظاہری اعضا کی صفائی ستھرائی تو ہے ہی، لیکن اس کا نفع دنیوی زندگی تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ آخرت میں بھی اس کی حیرت انگیز برکتیں ظاہر ہوں گی، اس کی وجہ سے قیامت کے دن مسلمان کا چہرہ چمکتا ہوا کھل رہا ہو گا اور پیشانی نورانی اور روشن ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان میں آئے اور فرمایا:

”اے اہل ایمان کی بستی! تم سب پر سلامتی ہو، اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں، میری خواہش ہے کہ ہم نے اپنے بھائیوں کو بھی دیکھا ہوتا“، صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ؟ آپ نے جواب دیا: ”تم میرے صحابہ (ساتھی) ہو، اور ہمارے بھائی وہ لوگ ہیں جو ابھی تک دنیا میں نہیں آئے“۔ اس پر انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اپنی امت کے ان لوگوں کو جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئے کیسے پہچانیں گے ؟ تو آپ نے فرمایا: ”بتاؤ! اگر کالے سیاہ گھوڑوں کے درمیان کسی کے سفید چہرے، سفید پاؤں والے گھوڑے ہوں تو کیا وہ اپنے گھوڑوں کو نہیں پہچانے گا؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا: وہ وضو کی وجہ سے روشن

چہروں، سفید ہاتھ پاؤں کے ساتھ آئیں گے..."۔[مسلم شریف]

صفائی ستھرائی کے پیش نظر ہی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد بھی ہاتھ دھونے کا حکم حدیث پاک میں وارد ہے۔

دانتوں کی صفائی کی اہمیت

دانتوں کی صفائی سے متعلق اسلام کی تعلیمات نہایت واضح اور تاکیدی ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ منہ اور دانت کی صفائی، اس کی بدبو کا ازالہ اور اس کی نگہ داشت کا حکم جس طرح اہتمام و تاکید کے ساتھ اسلام نے دیا ہے، اس کی نظیر کسی مذہب میں نہیں ہے، خواہ وہ قدیم مذاہب ہوں یا جدید — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی شدت کے ساتھ اس کا اہتمام فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی حکم فرماتے تھے اور مختلف انداز سے ترغیب دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے:

«تَسَوَّكُوا؛ فَإِنَّ السِّوَاكَ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ، مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ، مَا جَاءَنِي جِبْرِيلُ إِلَّا أَوْصَانِي بِالسِّوَاكِ، حَتَّى لَقَدْ خَشِيتُ أَنْ يُفْرَضَ عَلَيَّ وَعَلَى أُمَّتِي». [ابن ماجه]

"مسواک کرو، اس لیے کہ مسواک منہ کو پاک صاف کرنے کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا سبب ہے، جبریل جب بھی میرے پاس آئے تو انھوں نے مجھے مسواک کی وصیت کی، یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اسے میرے اور میری امت کے اوپر فرض نہ کر دیا جائے"۔[ابن ماجہ]

مسوڑھوں اور دانتوں کے اندر پیدا ہونے والی بیماریاں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی

ہیں، جن کی بنیادی وجہ دانتوں کی صفائی کے سلسلے میں لاپرواہی ہے، اسی طرح اگر ان کی صفائی نہ کی جائے تو ایسی اذیت ناک بدبو نکلتی ہے کہ ایسے شخص کے قریب جانا تو درکنار، دور سے بھی گفتگو کرنے سے پاکیزہ اور نفیس طبیعت کے لوگ کتراتے ہیں، اسی لیے شریعت میں دانتوں کی صفائی کا حکم مبالغے کی حد تک دیا گیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

«لَقَدْ أُمِرْتُ بِالسِّوَاكِ حَتَّى خَشِيْتُ أَنْ أَدْرَدَ».

[أخرجه البزار]

"مجھے مسواک کرنے کا اس قدر حکم دیا گیا کہ مجھے یہ ڈر ہوا کہ میرے سارے دانت گر نہ جائیں"۔[مسند بزار]

معاشرے کا لحاظ اور احترام

اسلام دراصل تہذب و تمدن کا سرچشمہ ہے، اسی لیے اس کی تعلیمات میں ہر فرد کو ذاتی طور پر صفائی ستھرائی کے حکم کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے افراد کا بھی خیال رکھنے اور ان کے جذبات واحساسات کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اجتماعات میں حاضر ہو، بالخصوص مساجد میں تو اسے کچی پیاز یا کچا لہسن کھا کر آنے سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ اس کی بدبو سے شرکائے مجلس اور حاضرین مسجد کو اذیت پہنچے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَكَلَ ثُومًا أَوْ بَصَلًا، فَلْيَعْتَزِلْنَا - أَوْ قَالَ: فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا - وَلْيَقْعُدْ فِي بَيْتِهِ ...». [صحيح البخاري]

"جو لہسن یا پیاز (پکائے بغیر) کھائے ہوئے ہو وہ ہم سے دور رہے، یا (یہ

کہا) اسے ہماری مسجد سے دور رہنا چاہیے اور اپنے گھر میں ہی بیٹھنا چاہیے"۔

[بخاری شریف]

ظاہر کو سنوارنا بھی مطلوب شریعت ہے

اسلامی تعلیمات کا ایک حسین پہلو یہ ہے کہ اس نے ہر مسلمان کو اس بات کا مکلف بنایا ہے کہ وہ ظاہری شکل وصورت کو بھی سنوار کر رکھے اور اپنی ہیئت ایسی بنا کر رکھے جو مقبول اور خوش منظر ہو، یہاں تک کہ اس حسنِ منظر کو نماز جیسی عظیم عبادت کے آداب میں شامل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَـٰبَنِىٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف: ۳۱]

"اے اولادِ آدم! جب کبھی مسجد میں آؤ تو اپنی خوش نمائی کا سامان (یعنی لباس جسم پر) لے کر آؤ"۔[سورۂ اعراف:۳۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً صحابۂ کرامؓ کو اس جانب متوجہ فرماتے تھے اور انہیں ظاہری ہیئت اور حلیہ کو دیدہ زیب شکل میں رکھنے کی تاکید فرماتے تھے۔ ایک روایت میں ہے:

«مَنْ كَانَ لَهُ شَعْرٌ فَلْيُكْرِمْهُ». [أبو داؤد]

"کسی کے بال ہوں تو وہ ان کا اکرام کرے"۔ یعنی سنوار کے رکھے، پراگندہ نہ رکھے۔

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے لمبے لمبے بال تھے، تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روز ان بالوں سے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے انہیں بالوں کو سنوار کر

رکھنے اور ہر روز کنگھی کرنے کا حکم فرمایا"۔[نسائی شریف]

حضرت عطاء ابن یسارؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے، تو آپؐ نے انہیں بالوں کو صحیح کرنے کا حکم فرمایا، چناں چہ انہوں نے حکم کی تعمیل کی (یعنی کنگھی وغیرہ کرکے بالوں کی اصلاح کرکے دوبارہ آپؐ کی خدمت میں آئے) تو آپ نے فرمایا:

«أَلَيْسَ هَذَا خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدُكُمْ ثَائِرَ الرَّأْسِ كَأَنَّهُ شَيْطَانٌ». [موطأ للإمام مالك]

"کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں کا کوئی پراگندہ بال آئے گویا کہ وہ شیطان ہے"۔[موطاامام مالک]

ظاہری رکھ رکھاؤ کی فکر اور اصلاحِ باطن سے غفلت

بالوں کی درستگی، بدن اور کپڑوں کی صفائی ستھرائی، دانت اور منہ کی صفائی کا مبالغے کی حد تک اہتمام، خوشبو کا استعمال اور ظاہری شکل وصورت کو عمدہ بناکر رکھنا شرعاً مطلوب ہے؛ لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ ظاہر کی اتنی فکر ہو کہ باطن کی اصلاح کو فراموش کردے، یا یہ کہ ظاہری بناؤ سنگھار میں فضول خرچی کی حد تک دلچسپی لے۔ اگر ظاہری آراستگی اور حسن وجمال کا اثر کسی انسان کے دل ودماغ پر اس حد تک سوار ہوجائے کہ اس کی وجہ سے باطنی خرابی میں مبتلا ہوجائے، مثلاً تکبر، گھمنڈ اور غرور میں مبتلا ہوجائے، یا دوسروں کی تحقیر دل میں پیدا ہوجائے، تو یہ نہایت خطرناک چیز ہے، بلکہ اس پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ» فَقَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً؟ قَالَ: «إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ، وَغَمْطُ النَّاسِ». [مسلم]

"وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا"۔ ایک آدمی نے کہا: انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کے جوتے اچھے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر (دراصل) حق کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے"۔[مسلم شریف]

پراگندگی کو ولایت اور بزرگی سمجھنا اسلام پر بہتان ہے

قرآن وحدیث کی ان واضح ہدایات، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سیرت اور صحابۂ کرام کے پاکیزہ طرز عمل کے باوجود کچھ لوگ جہالت اور نادانی کی وجہ سے گندے کپڑے پہننے، مکروہ شکل وشباہت اختیار کرنے اور دیوانوں کی سی صورت بنائے رکھنے کو بزرگی اور ولایت سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ اسلام پر صریح بہتان ہے، اسلام حسین وجمیل مذہب ہے اور حسن وجمال کو پسند کرتا ہے، صفائی ستھرائی اور خوش نمائی اس کے خمیر میں شامل ہے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

"جب خوارج نکلے تو میں علیؓ کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: تم ان لوگوں کے

پاس جاؤ، تو میں یمن کا سب سے عمدہ جوڑا پہن کر ان کے پاس گیا — ابوزمیل کہتے ہیں: ابن عباسؓ ایک خوب صورت اور وجیہ آدمی تھے — ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے خوش آمدید کہا اور (حیرت سے) پوچھا: یہ کیا پہنے ہوے ہو؟ حضرت ابن عباس نے کہا: تم مجھ میں کیا عیب نکالتے ہو، میں نے رسول اللہ ﷺ کو اچھے سے اچھا جوڑا پہنتے ہوے دیکھا ہے"۔

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں:

«مَا رَأَيْتُ مِنْ ذِي لِمَّةٍ أَحْسَنَ فِي حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ». [مسلم]

"میں نے کسی دراز گیسوؤں والے شخص کو سرخ جوڑے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین نہیں دیکھا"۔ [مسلم شریف]

یہ وہ پر بہار شریعت ہے اور رسول اکرم ﷺ کی حسین وجمیل سیرت ہے جو فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اور تہذیب وشائستگی میں بے مثال ہے اور کیوں نہ ہو، خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ (ﷺ)». "بہترین طریقۂ کار محمد (ﷺ) کا ہے"۔

ان سب کے باوجود اگر کوئی مسلمان بدبودار کپڑے پہننے اور عرصے تک غسل نہ کرنے، خوشبو اور خوشنمائی سے دور بھاگنے کو قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھے یا ولایت وبزرگی سمجھے تو یہ سراسر گمراہی ہے۔

راستوں اور گھروں کی صفائی کا اہتمام

صفائی ستھرائی اور اسلامی ذوقِ جمالیات کا تعلق صرف انسان کے جسم اور اس کے لباس سے نہیں ہے؛ بلکہ پورے معاشرے سے ہے، خواہ وہ مسجدیں ہوں جن میں خدائے بزرگ و برتر کی عبادت کی جاتی ہے، یا وہ مکانات ہوں جن میں انسان سکون کا سانس لیتا ہے، یا آفس اور جائے عمل ہوں جہاں وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیتا ہے یا وہ راہیں اور سڑکیں ہوں جن پر چلتا یا جن سے گزرتا ہے، الغرض ہر جگہ اور ہر مقام کو صاف ستھرا رکھنے کی تاکید ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطِّيبَ نَظِيفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ كَرِيمٌ يُحِبُّ الْكَرَمَ جَوَّادٌ يُحِبُّ الْجُودَ فَنَظِّفُوا أَفْنِيَتَكُمْ وَسَاحَاتِكُمْ وَلَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُودِ». [الترمذي]

”اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکی (صفائی ستھرائی) کو پسند کرتا ہے، اللہ مہربان ہے اور مہربانی کو پسند کرتا ہے، اللہ سخی ہے اور سخاوت کو پسند کرتا ہے، لہٰذا تم صاف ستھرا رکھو اپنے گھروں کے صحنوں اور سامنے کے میدانوں کو اور یہود سے مشابہت نہ اختیار کرو“۔ [ترمذی شریف]

حضور ﷺ کے زمانے میں یہودیوں کی عادت تھی کہ اپنے گھر صاف کرتے تھے اور کوڑا اپنے گھر کے سامنے لا کر پھینک دیتے تھے، اس لیے آپؐ نے ان کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا۔ یعنی مسلمان کو چاہیے کہ اپنا گھر بھی صاف رکھے اور گھر کے دالان، صحن اور باہر کے میدان کو بھی صاف ستھرا رکھے۔

بعض بے ہنگم لوگ اپنے گھر کی گندگی لاکر گھر کے سامنے راستے پر پھینک دیتے ہیں، اسی طرح کچھ غیر مہذب لوگ مشروبات کا استعمال کر کے بوتلیں وغیرہ سڑک پر پھینک دیتے ہیں، یا کوئی چیز کھاکر بقایا راستے میں ڈال دیتے ہیں، یہ ساری چیزیں اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، اسلامی مزاج یہ ہے کہ آپ اپنی گزر گاہوں کو بھی صاف رکھیں اور اگر کسی ناشائستہ شخص نے راستے میں تکلیف دہ چیز پھینک دی ہے تو آپ اسے اٹھاکر ٹھکانے لگادیں، اس پر آپ کو صدقے کا ثواب ملے گا، کیوں کہ اسلام نے اس عمل کو ایمان کا شعبہ قرار دیا ہے۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

«وَكُلُّ خُطْوَةٍ يَخْطُوهَا إِلَى الصَّلاَةِ صَدَقَةٌ، وَيُمِيطُ الأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ صَدَقَةٌ». [صحيح البخاري]

”اور ہر قدم جو نماز کے لیے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور اگر کوئی راستے سے کسی تکلیف دینے والی چیز کو ہٹادے تو وہ بھی ایک صدقہ ہے“۔ [بخاری شریف]

یعنی راستے میں پتھر، کانٹا یا نجاست وگندگی پڑی ہو تو اسے ہٹادینا صدقہ ہے، اس پر اجر وثواب لکھا جاتا ہے۔

صفائی ستھرائی اور تندرستی کا باہمی ربط

صفائی ستھرائی کا براہ راست تعلق انسانی صحت وعافیت سے ہے، کیوں کہ نجاست، غلاظت اور گندگی کے نتیجے میں ہلاکت خیز بیماریاں وجود میں آتی ہیں، جب کہ طہارت، پاکیزگی اور صفائی کے نتیجے میں نہ صرف قلب وروح کو بالیدگی ملتی ہے، بلکہ جسم کو بھی قوت

وعافیت نصیب ہوتی ہے۔

اسلامی نظام جو دراصل خدائی نظام ہے، وہ ایسا معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے جس کے افراد چست، پھرتیلے، طاقت ور اور تندرست ہوں، اسی لیے حدیث پاک میں طاقت ور مؤمن کو بہتر اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں پسندیدہ بتایا گیا ہے کم زور مؤمن سے، اسی نظریے کے پیش نظر رسول اکرم ﷺ نے تیراندازی، تیراکی اور شہہ سواری کی مشق کا حکم دیا ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ اسلام، کسی طرح کی گندگی، نجاست اور غلاظت کو برداشت کرتا جس کے نتیجے میں صحت کو تباہ کرنے والے جراثیم پلتے، بڑھتے اور معاشرے میں پھیل جاتے ہیں۔

حفظانِ صحت کے اسی اصول کے پیش نظر سب سے پہلے اسلام نے ہی ”حجرِ صحی“ یعنی Quarantine کا فارمولا پیش کیا، لہٰذا کسی شہر یا بستی میں کوئی وبائی بیماری پھیل گئی ہو تو اسلامی تعلیمات کے مطابق وہاں سے کسی کو دوسری جگہ نہیں جانا چاہیے، اسی طرح دوسری جگہ سے کسی کو ان مقامات پر نہیں آنا چاہیے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا سَمِعْتُمْ بِالطَّاعُونِ بِأَرْضٍ فَلاَ تَدْخُلُوهَا، وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلاَ تَخْرُجُوا مِنْهَا». [صحيح البخاري]

”جب تم سن لو کہ کسی جگہ طاعون کی وباء پھیل گئی ہے تو وہاں مت جاؤ، لیکن جب کسی جگہ یہ وباء پھوٹ پڑے اور تم وہیں موجود ہو تو وہاں سے باہر مت جاؤ“۔[بخاری شریف]

تاہم اگر کوئی شخص صبر واحتساب کے ساتھ اس مقام پر ٹھہرا رہے، دوسری جگہ جاکر دوسروں کی بیماری کا سبب نہ بنے، پھر اسی حال میں اس وباء کے نتیجے میں اس کی موت آجائے تو اسے شہید کا اجر وثواب ملتا ہے۔[بخاری شریف]

خلاصۂ گفتگو

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، وہ پاکی اور صفائی ستھرائی پسند فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اطہر وانور ہیں، اور پاکی صفائی ستھرائی اور خوشبو پسند فرماتے ہیں، لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کے ہر شعبے میں صفائی ستھرائی کا خیال رکھے: اپنے جسم، دانت اور منہ، کپڑے، بستر کی چادر، لحاف، تکیہ، کمرہ، گھر، دالان، صحن، گھر کے سامنے کی جگہ، گاڑی یہاں تک کہ راستوں تک کی صفائی کا خیال رکھے، اس کی وجہ سے شریعت پہ عمل کرنے کا اجر بھی ملے گا اور مختلف قسم کے جراثیم سے بھی بچیں گے جو بیماریوں کا سبب بنتے ہیں، پھر اس کے نتیجے میں ایسا دلکش معاشرہ وجود میں آئے گا جو دوسروں کو بھی اسلام کے پاکیزہ نظام کی طرف دعوت دے رہا ہو گا۔ اللہ ہمارا ظاہر بھی پاک کردے اور باطن بھی۔

❋ ❋ ❋

۱۴۳۹/۷/۱۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانیت کی خدمت

بہترین انسان

اللہ تعالیٰ نے ہمیں لوگوں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأۡمُرُ بِٱلۡعَدۡلِ وَٱلۡإِحۡسَٰنِ وَإِيتَآيِٕ ذِي ٱلۡقُرۡبَىٰ﴾ [النحل: ۹۰]

"بیشک اللہ انصاف کا، احسان کا اور رشتے داروں کو (ان کے حقوق) دینے کا حکم دیتا ہے"۔[سورۂ نحل:۹۰]

دوسری جگہ احسان کرنے والوں کا بدلہ بھی بتلا دیا:

﴿لِّلَّذِينَ أَحۡسَنُواْ فِي هَٰذِهِ ٱلدُّنۡيَا حَسَنَةٞۚ وَلَدَارُ ٱلۡأٓخِرَةِ خَيۡرٞۚ وَلَنِعۡمَ دَارُ ٱلۡمُتَّقِينَ ٣٠﴾ [النحل: ۳۰]

"جن لوگوں نے احسان کیا ان کے لیے اس دنیا میں بھی بہتری ہے اور آخرت کا گھر تو ہے ہی سراپا بہتری، یقینا متقیوں کا گھر بہترین ہے"۔[سورۂ نحل:۳۰]

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ». [حديث حسن، ابن حبان ومسند الشهاب والطبراني في الأوسط]

”سب سے بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو“۔

[ابن حبان ومسند الشہاب والطبرانی فی الاوسط]

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنا کنبہ کہا ہے، ظاہر ہے کہ اس خالق کائنات کے کنبے کو اگر کوئی نفع پہنچائے گا تو یقینا اسے پسند آئے گا، اسی لیے ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَحَبُّ النَّاسِ إِلَى اللهِ أَنْفَعَهُمْ لِلنَّاسِ، وَأَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ سُرُورٌ تُدْخِلُهُ عَلَى مُسْلِمٍ، أَوْ تَكْشِفُ عَنْهُ كُرْبَةً، أَوْ تَقْضِي عَنْهُ دَيْنًا، أَوْ تَطْرُدُ عَنْهُ جُوعًا، وَلَأَنْ أَمْشِيَ مَعَ أَخٍ لِي فِي حَاجَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَعْتَكِفَ فِي هَذَا الْمَسْجِدِ، يَعْنِي مَسْجِدَ الْمَدِينَةِ، شَهْرًا». [الترغيب والترهيب]

”لوگوں میں اللہ کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو ان کے لیے زیادہ نفع بخش ہو، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین اعمال یہ ہیں کہ کسی مسلمان کو (اپنے کردار یا گفتار سے) خوش کردے یا اس کی کوئی مصیبت دور کرے، یا اس کا قرض ادا کردے، یا اس کی بھوک ختم کردے، اور میں اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے چلوں، یہ میرے نزدیک اس مسجد (مسجد مدینہ یعنی مسجد نبوی) میں ایک ماہ اعتکاف کرنے سے زیادہ محبوب ہے“۔[الترغیب والترہیب]

حاجت مند ہمارا محسن

ہمارے اسلاف کا بھی عجیب وغریب حال تھا، وہ جب کسی کی ضرورت پوری کرتے تھے، یا کوئی اپنی ضرورت لے کر ان کے پاس آتا تھا تو وہ اس کے احسان مند ہوتے تھے، اس کے شکرگزار ہوتے تھے کہ اس نے انہیں اپنی ضرورت کے لیے منتخب کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”تین طرح کے لوگ ہیں جن کے احسان کا بدلہ میں نہیں چکا سکتا: ایک وہ شخص جس نے مجھے سلام کرنے میں پہل کی، دوسرے وہ جس نے مجلس میں میرے لیے کشادگی پیدا کی، تیسرے وہ شخص جس کے قدم گرد آلود ہوئے کیونکہ مجھے سلام کرنے کے ارادے سے وہ چل کر آیا۔ آگے فرمایا کہ ایک چوتھا شخص بھی جس کے احسان کا بدلہ تو صرف اللہ ہی دے سکتا ہے، اور یہ وہ ہے جس پر کوئی مصیبت آئی اور وہ پوری رات یہ سوچتا رہا کہ آخر یہ پریشانی کس سے بیان کروں جو دور کر سکے، بالآخر اس نے مجھے اس لائق سمجھا اور اپنی ضرورت لے کر میرے پاس آگیا“۔ [رواہ البیہقی فی شعب الایمان والدینوری فی المجالسۃ]

حضرت زین العابدین علی بن الحسین بن علی رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ رات کے اندھیرے میں چپکے سے اٹھتے تھے اور آٹا وغیرہ اپنی پشت پر لاد کر گھر سے نکلتے اور مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے مخصوص فقراء ومساکین کے گھروں تک پہنچاتے جو ضرورت مند تو ہوتے تھے لیکن استغنا اور حیا کی وجہ سے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔ جب حضرت زین العابدینؒ کا انتقال ہو گیا تو ان خاندانوں کا راشن آنا بند ہو گیا، تب انہیں معلوم ہوا کہ وہ سب

کچھ لانے والا کون تھا۔ ان کی وفات کے بعد جب غسل دیا جارہا تھا توان کی پشت پر کالے نشانات تھے، جب گھر والوں سے اس کی وہ دریافت کی گئی تو پتہ چلا کہ راتوں کو پشت پر آٹا اور دیگر راشن لاد کر مسکینوں اور حاجت مندوں تک خود ہی پہنچاتے تھے، یہ اسی کے آثار ہیں۔[صور من حیاۃ التابعین]

نفع رسانی ـــــ حصولِ خیر اور دفعِ شر کا ضامن

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اوپر جب پہلی وحی نازل ہوئی تھی تو اس وقت آپؐ غار حراء میں تھے، حضرت جبریل علیہ السلام نے آپؐ کو بہت زور سے بھینچا تھا جو حضورؐ کی برداشت کی آخری حد تک پہنچ گیا تھا، سورۂ علق کی شروع کی آیتیں نازل ہوئی تھیں، ان کو لے کر آپؐ دولت کدے پر پہنچے تو اس وقت آپؐ کے کندھوں اور گردن کے درمیان کے گوشت کے حصے لرزرہے تھے، آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: مجھے کپڑا اُڑھاؤ، پھر آپؐ نے حضرت خدیجہ سے یہ بھی فرمایا کہ یہ مجھے کیا ہورہا ہے؟ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپ کی تسلی اور دل داری کے لیے جو کلمات کہے وہ یہ تھے:

> ”آپ کو خوش خبری ہو، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا، اللہ کی قسم آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچی بات کہتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، اسے کما کر دیتے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو، مہمان نوازی کرتے ہیں، اللہ کی طرف سے آنے والی مصیبتوں پر مدد کرتے ہیں“۔[بخاری شریف]

حضرت خدیجہؓ کا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ان مبارک عادتوں کا ذکر کرکے یہ استدلال کرنا کہ اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، یہ صاف صاف بتلارہا ہے کہ دوسروں کی اعانت و مدد کرنا،

کمزوروں کا سہارا بننا، صلۂ رحمی کرنا، مہمان نوازی کرنا اور خیر کے کام کرنا حقیقت میں انسان کو ناگہانی آفتوں اور مصیبتوں سے بچانے کا ذریعہ اور حصولِ خیر و برکت کا پیش خیمہ ہے۔

اسی لیے حضور ﷺ نے اس امر کی طرف متوجہ فرمایا اور ترغیب دی کہ جہاں تک ممکن ہو تم دوسروں کو نفع پہنچاؤ۔

«مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَنْفَعَ أَخَاهُ فَلْيَفْعَلْ». [رواه مسلم]

تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کسی طرح کا فائدہ پہنچا سکتا ہو تو اسے (ضرور) پہنچانا چاہیے"۔[مسلم شریف]

صحیحین کی روایت میں ہے:

«مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللهُ فِي حَاجَتِهِ». [رواه مسلم]

"جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مشغول ہو تو اللہ اس کی حاجت روائی میں لگ جاتے ہیں"۔[مسلم شریف]

خیر خواہی صدقہ ہے

خیر خواہی اور نفع رسانی بھی ایک طرح کا صدقہ ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

«كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ». [صحيح البخاري]

"ہر بھلائی صدقہ ہے"۔[بخاری شریف]

برادرانہ حقوق کی ادائیگی پر بھی صدقے کا اجر و ثواب ملتا ہے، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ ہم دردانہ سلوک اور اس کے حقوق کی ادائیگی، دراصل اس کے ساتھ خیر خواہی اور نفع رسانی کی ایک شکل ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«حَقُّ المُسْلِمِ عَلَى المُسْلِمِ خَمْسٌ: رَدُّ السَّلاَمِ، وَعِيَادَةُ المَرِيضِ، وَاتِّبَاعُ الجَنَائِزِ، وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ، وَتَشْمِيتُ العَاطِسِ».

[متفق عليه]

”مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: سلام کا جواب دینا، بیمار کی مزاج پرسی کرنا، جنازے کے ساتھ چلنا، دعوت قبول کرنا اور چھینک پر (اس کے الحمد للہ کے جواب میں) یَرْحَمُكَ اللهُ کہنا“۔

اسی خیر خواہی اور نفع رسانی کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر ظلم ہو رہا ہو تو اس کی حمایت کرے، مظلوم کی حمایت و نصرت، اسلامی اور انسانی اقدار کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اسی لیے حدیث پاک میں آیا ہے:

«مَنْ مَشَى مَعَ مَظْلُومٍ حَتَّى يُثْبِتَ لَهُ حَقَّهُ ثَبَّتَ اللهُ قَدَمَيْهِ عَلَى الصِّرَاطِ يَوْمَ تَزِلُّ الأَقْدَامُ». [الترغيب والترهيب]

جو شخص کسی مظلوم کے حق کو ثابت کرنے کے لیے چلے گا تو اللہ تعالیٰ پل صراط پر اس کے قد کو جما دیں گے جس دن قدم ڈگمگا جائیں گے“۔[ترغیب وترہیب]

نفع رسانی، دخولِ جنت کا سبب

سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے جنت کا خدائی فیصلہ مل جائے اور جہنم سے خلاصی کی ضمانت حاصل ہو جائے:

﴿فَمَن زُحْزِحَ عَنِ ٱلنَّارِ وَأُدْخِلَ ٱلْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾

[آل عمران: ۱۸۵]

”جو شخص آگ سے ہٹا دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے بیشک وہ

کامیاب ہو گیا"۔[سورۂ آل عمران:۱۸۵]

دوسروں کو نفع اور فائدہ پہنچانے کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو گا کہ اس کی وجہ سے نفع بخش آدمی جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوزخ سے بَری۔ چناں چہ امام بیہقی نے حضرت ابوذرؓ سے روایت نقل کی ہے، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! بندے کو جہنم سے کیا چیز نجات دلائے گی؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ پر ایمان۔ میں نے عرض کیا: ایمان کے ساتھ عمل بھی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے خرچ کرے۔ میں نے عرض کیا: اگر وہ فقیر ہو، اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ ہو ہی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔ میں نے عرض کیا: اگر وہ یہ کام نہ کر سکے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر؟ فرمایا: کسی بے روزگار نادار شخص کے لیے کما کے کچھ دے۔ میں نے عرض کیا: اگر وہ خود بھی کچھ کرنا یا کمانا نہ جانتا ہو؟ آپؐ نے فرمایا: کسی مظلوم کی حمایت کرے۔ میں نے عرض کیا: اگر وہ کمزور ہو، کسی مظلوم کی حمایت و نصرت نہ کر سکتا ہو؟ تو آپؐ نے فرمایا: تم نہیں چاہتے کہ تمہارے (اس مفروضہ) ساتھی میں کوئی خیر باقی رہے۔ چلو وہ اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ رکھے (یعنی اگر مذکورہ خیر کے کام نہیں کر سکتا تو کم از کم یہ کرے کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے)۔ میں نے عرض کیا: اگر کسی نے یہ کر لیا تو کیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا؟ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: کوئی بھی ایمان والا ان خصلتوں میں سے کسی ایک خصلت کو بھی اپنا لے گا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے جنت میں لے جائے گی"۔[رواہ البیہقی]

امت مسلمہ کے خیر امت ہونے کے جو اسباب ہیں ان میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ یہ امت تمام امتوں میں سب سے زیادہ لوگوں کے لیے نفع بخش ہے جس کے متعدّد طریقے اور مختلف اسالیب ہیں، جن میں سرفہرست دوسروں کی ہدایت کی محنت اور اسلام

کے ابدی اور آفاقی پیغام سے متعارف کرانا ہے۔

نفع رسانی ـــــ ذاتی اور متعدّی

نفع رسانی کی دو قسمیں ہیں، ایک ذاتی جس کا دائرہ ہر انسان کی اپنی ذات تک محدود ہے، دوسری قسم متعدّی ہے، یہ وہ نفع رسانی ہے جس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، اس کی وسعت کے اعتبار سے اس کا اجر و ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ذاتی فائدہ تو ہر شخص چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشاں بھی رہتا ہے، لیکن صرف اپنی ذات کے لیے جینا اور اپنی تمام تر کدو کاوش کا دائرہ اپنی ہی حد تک محدود رکھنا نہ قابل تعریف ہے نہ مطلوبِ شرع ہے۔ کمال یہ ہے کہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو، مظلوموں کی دادرسی کرے، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرے، اشک بار آنکھوں کے آنسو پوچھے، بھوکے کو کھانا کھلائے، پیاسے کو پانی پلائے، ننگے کو کپڑا پہنائے، اگر استطاعت ہو تو مقروض کے قرض ادا کرے، کسی غریب کے بچے کی تعلیم کا انتظام کرے، یتیموں کی کفالت کرے، یتیم کے سر پر ہم دردی کا ہاتھ پھیرے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے وہ کام جن کا نفع اپنی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ دوسروں تک پہنچے یہ اسلام کی نظر میں زیادہ قابل تعریف اور باعث اجر و ثواب ہے۔

منجملہ ان عبادات کے جن کا نفع متعدّی ہوتا ہے، شرعی علوم کی تعلیم و تدریس بھی ہے، حدیث پاک میں ہے:

«مَنْ عَلَّمَ عِلْمًا فَلَهُ أَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهِ، لَا يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِ

الْعَامِلِ». [ابن ماجه]

”جس نے کسی کو علم دین سکھایا، تو اس کا اتنا ثواب ملے گا جتنا اس شخص کو جو اس پر عمل کرے گا، اور عمل کرنے والے کے ثواب سے کوئی کمی نہیں ہوگی“۔[ابن ماجہ]

ایک دوسری روایت میں حضورؐ کا ارشاد ہے:

«خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ». [صحيح البخاري]

”تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے“۔[بخاری شریف]

قرآن سیکھنے اور سکھانے والا ذاتی اور متعدّی دونوں نفع رسانی کا حامل ہے، جس طرح داعی الی اللہ کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے جو دوسروں کو دعوت دیتا ہے اور خود بھی نیک عمل کرتا ہے:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَآ إِلَى ٱللَّهِ وَعَمِلَ صَٰلِحًا وَقَالَ إِنَّنِى مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ﴿٣٣﴾﴾ [فصلت: ٣٣]

”اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف دعوت دے، اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں یقیناً مسلمانوں میں سے ہوں“۔[حم السجدۃ:۳۳]

جو شخص دوسروں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے اس ”معلّم خیر“ کی مثال رسول اکرمؐ نے اس بارانِ رحمت سے دی ہے جس کا نزول کسی زرخیز زمین پر ہوا ہو، جہاں سے مختلف انواع کے پودے اور درخت نمودار ہوے۔ اس ”معلّم خیر“ کا مقام اللہ تعالیٰ نے اس قدر بلند فرمایا کہ زمین وآسمان والوں کو اس کے لیے دعائے مغفرت پہ مامور فرمادیا۔

مؤذن کے جو فضائل احادیث میں بیان کیے گئے ہیں ان کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ

اس کے اس مبارک عمل کا نفع عام ہوتا ہے، یہ عمل بھی ان عبادات میں سے ہے جو متعدّی ہوتی ہیں، اسی لیے رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الْمُؤَذِّنُ يُغْفَرُ لَهُ بِمَدِّ صَوْتِهِ وَيَشْهَدُ لَهُ كُلُّ رَطْبٍ وَيَابِسٍ». [رواه النسائي]

''مؤذن کی بخشش کی جاتی ہے جہاں تک اس کی (اذان کی) آواز پہنچے اور ہر خشک وتر چیز (جاندار اور بے جان) اس کے لیے گواہی دے گی''۔

[نسائی شریف]

ان متعدّی عبادات کا ایک حصہ ''نصیحت'' اور دوسروں کی خیر خواہی ہے، جیسا کہ رسول پاک صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«الدِّينُ النَّصِيحَةُ» [مسلم]

دین نام ہی ہے خیر خواہی کا، دوسروں کی دنیا اور آخرت کی بھلائی کی فکر کرنا، ان کی صحیح رہنمائی کرنا، ان کی کمی کوتاہی پر پردہ پوشی کرنا، ان کے لیے جو باعث نقصان وخسارہ چیزیں ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرنا، نفع بخش چیزوں کی طرف متوجہ کرنا، بلکہ اس سلسلے میں ان کا تعاون کرنا، بڑوں کی عزت وتکریم کرنا اور چھوٹوں پر شفقت ومہربانی کرنا۔

نفع رسانی کا ایک اہم اور متعدّی عمل یہ ہے کہ کسی ظالم یا مظلوم کی نصرت کی جائے، مظلوم کی نصرت تو یہ ہے کہ اس پر کیے جانے والے مظالم کو دور کیا جائے اور ظالم سے اُسے چھٹکارا دلایا جائے؛ لیکن ظالم کی نصرت کیسے کی جائے؟ ظالم کی نصرت یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دیا جائے، کیوں کہ ظلم کا انجام دنیا میں بھی برا ہوتا ہے اور آخرت میں تو «الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ» تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں، لہٰذا ظالم کو ظلم سے روکنا دراصل اس کی مدد

کرنا ہے، تاکہ بدترین انجام سے بچ سکے۔

صلح کرانا

آپس میں جھگڑنے والے دو شخصوں یا دو گروہوں کے درمیان صلح کرانا نہایت عظیم اور اجر و ثواب کا کام ہے، یہ بھی نفع رسانی کی ایک صورت ہے، اللہ کی رضا کے لیے جو یہ کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اجر عظیم عطا فرمائیں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَّا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَىٰهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَٰحٍۭ بَيْنَ ٱلنَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ٱبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ ٱللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾﴾ [النساء: ١١٤]

”لوگوں کی بہت سی خفیہ سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتی، الا یہ کہ کوئی شخص صدقے کا یا کسی نیکی کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے۔ اور جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے گا، ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے“۔ [سورۂ نساء:۱۱۴]

صلح و صفائی کا کام اتنا اہم اور ضروری ہے کہ اس مقصد کے لیے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے تھے اور جن کی آپس کی رنجش ہوتی انہیں ملاتے اور رنجشیں دور فرماتے۔ اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ؟» قَالُوا: بَلَى، يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: «إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ الْحَالِقَةُ». [أبوداؤد]

''کیا میں تمہیں وہ بات نہ بتاؤں جو درجے میں روزے نماز اور زکاۃ سے بڑھ کر ہے؟ لوگوں نے کہا: کیوں نہیں، آپؐ نے فرمایا: آپس میں صلح کرادینا، اور آپ کی لڑائی تو سر مونڈنے والی ہے''۔ [ابوداؤد شریف]

مالی نفع رسانی

دوسروں کو نفع پہنچانے کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ مالی نفع رسانی بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اگر مال سے نوازا ہے تو اپنے اہل وعیال، اعزہ واقارب، دوست واحباب اور دیگر ضرورت مندوں پر فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ خرچ کیجیے، جو صدقہ کے مستحق ہیں انہیں صدقہ دیجیے، کیوں کہ صدقے سے مال کم نہیں ہوتا، اگرچہ بہ ظاہر کم ہوتا ہوا نظر آئے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ». [الترمذي]

''کسی بندے کا مال، صدقہ کرنے سے کم نہیں ہوتا''۔ [ترمذی شریف]

صحابۂ کرامؓ نے دل کی گہرائیوں سے اس بات کی تصدیق کی تھی اور نہایت فراخ دستی کے ساتھ اپنا محبوب ترین مال، اللہ کے راستے میں اور دوسرے مستحقین پر خرچ کیا، چناں چہ حضرت ابوطلحہؓ نے اپنا وہ باغ جو اُن کے نزدیک محبوب ترین اور نہایت قیمتی تھا، جس کا نام ''بیرحاء'' تھا، اسے اللہ کی خوشنودی کے لیے صدقہ کردیا۔

ابودحداحؓ نے نفع کا سودا کیا

جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مَن ذَا ٱلَّذِي يُقْرِضُ ٱللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَٰعِفَهُۥ لَهُۥٓ أَضْعَافًا كَثِيرَةً﴾ [البقرة: ٢٤٥]

"کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، تاکہ وہ اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدرجہا زیادہ ہو جائے؟"۔

تو حضرت ابوالدحداحؓ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض کا مطالبہ فرمارہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، تو حضرت ابوالدحداح نے کہا: آپ ذرا اپنا دست مبارک عنایت فرمائیں، چناں چہ آپؐ نے اپنا دست مبارک آگے فرمادیا تو انہوں نے عرض کیا: میں نے اپنے پروردگار کو اپنا باغ قرض میں دے دیا۔ ان کے اس باغ میں چھ سو کھجور کے درخت تھے اور اسی باغ میں ان کے اہل وعیال سکونت پذیر بھی تھے، یہ معاملہ کرکے باغ میں گئے اور آواز دی: اے ام الدحداح! انہوں نے کہا: لبیک، تو فرمایا: اس باغ سے نکل چلیں، کیوں کہ میں نے اپنے رب کے ساتھ اس کا سودا کرلیا ہے — ایمان ویقین کے ماحول میں پرورش پانے والی اس مومنہ خاتون نے یہ سن کر کہا: «رَبِحَ الْبَيْعُ أَبَا الدَّحْدَاحِ» ابوالدحداح! آپ نے بڑے ہی نفع کا سودا کیا اور خوب تعریفیں کیں۔ [مسلم شریف]

خلاصۂ کلام

خیر خواہی اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کے بے شمار منافع ہیں، ناگہانی آفتوں اور بلاؤں سے حفاظت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

«صَنَائِعُ الْمَعْرُوفِ تَقِي مَصَارِعَ السَّوْءِ، وَالْآفَاتِ

وَالْهَلَكَاتِ». [الجامع الصغير]

”بھلائی کے کام، برے انجام، آفتوں اور ہلاکتوں سے بچاتے ہیں“۔

[الجامع الصغیر]

بلکہ ان کی تعریف کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

”جو لوگ دنیا میں اہل خیر ہیں وہ آخرت میں بھی اہل خیر ہی ہوں گے (یعنی آخرت میں اہل خیر لوگوں کی صف میں کھڑے کیے جائیں گے)۔[الجامع الصغیر]

صلۂ رحمی کرنا، کھلانا پلانا، راستے سے اذیت ناک چیزوں کو ہٹانا، لوگوں کے مشکل وقت میں کام آنا، بیواؤں اور مسکینوں اور یتیموں کی کفالت کرنا، مظلوم کی دادرسی کرنا اور مصیبت زدہ کی تعزیت کرنا اور اس کے غم میں شریک ہونا، یہ اور اس طرح کے دیگر خیر وبھلائی کے کام کرنا نہ صرف انسان کے بلند اخلاق، کشادہ دل، فراخ دست اور اس کے بھلا ہونے کا پتہ دیتے ہیں؛ بلکہ نیک نامی اور اس کے لیے ذکر خیر کے ساتھ آفتوں اور بلاؤں سے حفاظت کا بھی ذریعہ ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو، دوسروں کے لیے نفع بخش بنائیں۔

* * *

۲۹/۳/۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امیدِ ثواب اور خوفِ عقاب

مومن وہ ہے جو اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے اور اس کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے، اس کا ایمان امید وخوف کے درمیان رہتا ہے، نہ صرف تمناؤں اور آرزؤں میں جیتا ہے، نہ ہی صرف خوف کی کیفیات میں مبتلا رہتا ہے، بلکہ ایک طرف اپنے برے اعمال کے نتائج سے خوف زدہ رہتا ہے تو دوسری طرف اللہ کی وسیع رحمت پر نظر رکھتا ہے، اسی لیے وتر کی جو دعائیں ثابت ہیں ان میں سے یہ بھی ہے:

«نَرْجُو رَحْمَتَكَ، وَنَخْشَى عَذَابَكَ» ”اے اللہ ہم آپ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور آپ کے عذاب سے ڈرتے ہیں“۔

[رواه البيهقي في السنن الكبرى]

امید وخوف کے فوائد

حقیقت یہ ہے کہ جس مسلمان کے دل میں امید وخوف کی دونوں کیفیات جمع ہوجاتی ہیں اس کے لیے نیک اعمال کرنا آسان ہوجاتا ہے، یہ دونوں کیفیتیں انسان کو حسنِ عمل پر آمادہ کرتی ہیں اور کردار وگفتار کی درستگی کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ اگر کسی بندے

کے دل میں صرف امید ہی امید ہو، تو اس کا امکان ہے کہ عمل سے بے بہرہ ہو جائے اور رحمتِ الٰہی کی وسعت کو عمل کے بغیر ہی اپنا استحقاق سمجھ بیٹھے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جہاں اپنی وسعتِ رحمت کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اس کے مستحق تقویٰ شعار، پرہیزگار اور زکات ادا کرنے والے مومن ہیں، عمل صالح کے بغیر امید و آس لگا کر بیٹھ جانا قرآنی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَن كَانَ يَرْجُوا۟ لِقَآءَ رَبِّهِۦ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَـٰلِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِۦٓ أَحَدًۢا ﴿١١٠﴾﴾ [الكهف: ١١٠]

”لہٰذا جس کسی کو اپنے مالک سے جا ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے، اور اپنے مالک کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے“۔[سورۂ کہف:۱۱۰]

لہٰذا ہر مسلمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ نیک عمل کرے اور اس پر اجر و ثواب کی امید رکھے، نیک عمل کر کے اسے بے کار اور بے سود نہ سمجھے، بلکہ اللہ کی ذاتِ رحیمی سے یہ توقع رکھے کہ اس کا بہترین بدلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔ اسی رحمتِ شان کی وجہ سے وہ اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کا حق بھی عنایت فرمائیں گے، یہ شفاعت بھی امت کے ان افراد کے لیے ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

«شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي» [رواه الترمذي وأبو داؤد]

”میری شفاعت، میری امت کے کبیرہ گناہ والوں کے حق میں ہوگی“۔

[ترمذی و ابوداؤد]

نیک عمل پر اللہ کی بے پناہ نوازش اور برے عمل پر سخت سزا

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جگہ جگہ اپنی صفات بیان فرمائی ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ وہ "سریع العقاب" یعنی جلدی سزا دینے والا ہے، جس طرح وہ "غفور رحیم" یعنی بخشش کرنے والا مہربان ہے۔ اپنی ان صفات کو بیان فرما کر اپنے بندوں کو بتایا ہے کہ تم جیسا کروگے ویسا پاؤگے: اخلاص کے ساتھ حسنِ عمل پر اس کی بے پناہ نوازشات کے مستحق بنوگے، جب کہ ریاکاری اور بداعمالی کی وجہ سے اس کی سزا کے مستحق قرار دیے جاؤگے، لہٰذا امید کے ساتھ ساتھ اس کی سزا کا خوف بھی رکھو، جو ڈرتا ہے وہ گناہوں سے بچتا ہے اور منزل تک پہنچنے کے لیے حسنِ تدبیر اختیار کرتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«مَنْ خَافَ أَدْلَجَ، وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللهِ غَالِيَةٌ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللهِ الْجَنَّةُ». [رواه الترمذي]

"جو دشمن کے خوف سے ڈرا وہ شروع رات میں ہی سفر کے لیے نکل پڑا اور جو شروع رات میں ہی نکل پڑا وہ منزل تک پہنچ گیا۔ سن لو! اللہ تعالیٰ کا سامان بڑا قیمتی ہے۔ آگاہ ہوجاؤ، اللہ تعالیٰ کا سامان جنت ہے"۔ [ترمذی شریف]

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی منزل تک پہنچنے کے لیے انسان جو سفر کرتا ہے، اگر اس سفر میں کوئی خطرے کی چیز ہو جس سے اپنا نقصان ہوسکتا ہو تو اس سے بچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے، ورنہ عین ممکن ہے کہ وہ خوف، حقیقت بن کر سامنے آجائے۔

سورۂ حجر کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دونوں صفات کو صاف صاف بیان فرمادیا

ہے اور حضورؐ کو یہ حکم دیا ہے کہ تمام بندگانِ خدا کو اس سے آگاہ کردیں کہ وہ بہت بخشنے والا مہربان بھی ہے اور نافرمانیوں پر سخت گیر بھی ہے:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيٓ أَنِّيٓ أَنَا ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٤٩﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ ٱلْعَذَابُ ٱلْأَلِيمُ ﴿٥٠﴾﴾ [الحجر: ٤٩ – ٥٠]

”میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہوں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے“۔[سورۂ حجر:۴۹-۵۰]

امید غالب ہو یا خوف

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے تھے کہ جب تک بندہ توانا تندرست ہو تو خوف کا غلبہ زیادہ مفید ہے، تاکہ گناہوں سے بچنے اور عبادت کی کثرت میں معاون بنے، لیکن جب بیماری میں مبتلا ہو جائے اور کثرت عمل سے عاجز و لاچار ہو جائے تو امید کا غلبہ ہونا چاہیے کیوں کہ اس حالت میں یہی زیادہ مفید ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو جب نیزہ مارا گیا اور انہیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ اب زندگی کے دن ختم ہو گئے ہیں، اس وقت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ تشریف لائے اور امید افزا باتیں سنانے لگے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں امید و آس کا غلبہ زیادہ بہتر ہے، چناں چہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا: امیر المؤمنین! آپ نے اس وقت اسلام قبول کر لیا تھا جب لوگ کفر پر اڑے ہوئے تھے، حضورؐ کے ساتھ مل کر آپ نے اس وقت جہاد کیا جب لوگوں نے حضورؐ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، پھر رسول اللہؐ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اس وقت آپ سے راضی تھے، آپ کی خلافت کے سلسلے میں کسی نے

کوئی اختلاف نہیں کیا، بالآخر آپ کو شہادت کی موت مل رہی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم نے جو کچھ ذکر کیا ہے یہ سب میرے اوپر اللہ کا احسان ہے، لیکن اب مجھے جس سنگین گھاٹی اور خوف ناک صورت حال کا سامنا کرنا ہے، اس سے بچنے کے لیے اگر میں ساری دنیا کا مالک ہوتا تو سب کچھ فدیہ میں دے دیتا۔ [ابن حبان، البیہقی والخطیب]

ہر مومن کو دو طرح کے اندیشے ہوتے ہیں؛ ایک اس وقت کے بارے میں جو گزر گیا، اسے پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، دوسرے زندگی کے جو دن باقی رہ گئے ہیں ان کے بارے میں، کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس کے سلسلے میں اللہ پاک کا کیا فیصلہ ہوگا، لہٰذا ہر بندے کو چاہیے کہ خود سے ہی اپنی ذات کے لیے اور اپنی دنیا سے اپنی آخرت کے لیے اور اپنی زندگی سے اپنی موت کے لیے توشہ تیار کرے، کیوں کہ موت کے بعد کسی سے معافی مانگنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اور اس دنیا کے بعد صرف دو ہی گھر ہیں؛ یا تو وہ جنت ہے یا دوزخ۔

دو خوف اور دو امن اکٹھے نہیں ہو سکتے

جس شخص نے دنیا میں خوفِ خدا کے ساتھ زندگی گزاری، وہ آخرت میں امن و سکون پائے گا اور جس شخص نے دنیا میں خدا کو بھول کر بے خوف و خطر اپنی مرضی کی زندگی گزاری وہ آخرت میں خوف ناک صورتِ حال کا سامنا کرے گا۔

دنیا میں اللہ کے احکام پر زندگی گزاری، اس کے خوف سے گناہوں سے بچتا رہا، حرام مال سے اجتناب کرتا رہا، ناجائز شہوت رانی سے دور رہا، یعنی پیٹ اور شرم گاہ دونوں کی حفاظت کرتا رہا تو وہ اللہ کی توفیق سے قیامت کے روز امن وامان پائے گا؛ لیکن اگر اس

دنیا میں اللہ کے احکام کو توڑتا رہا، گناہوں پر اصرار کرتا رہا، مالِ حرام سے اپنا پیٹ بھرتا رہا، حرام طریقے سے اپنی شہوت پوری کرتا رہا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پرواہ کیے بغیر زندگی گزارتا رہا تو وہ قیامت کے روز یقیناً ہول ناک اور الم ناک اور دردناک صورت حال سے دوچار ہوگا۔ حدیث قدسی میں ارشادِ باری ہے:

«وَعِزَّتِي لَا أَجْمَعُ عَلَى عَبْدِي خَوْفَيْنِ وَأَمْنَيْنِ: إِذَا خَافَنِي فِي الدُّنْيَا أَمَّنْتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَإِذَا أَمِنَنِي فِي الدُّنْيَا أَخَفْتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». [رواه ابن حبان في صحيحه والبيهقي في شعب الإيمان]

”میری عزت کی قسم میں اپنے بندے پر دو خوف اور دو امن جمع نہیں کروں گا: اگر وہ دنیا میں مجھ سے ڈرتا رہا تو قیامت کے روز اسے امن عطا کروں گا، اور اگر دنیا میں بے خوف رہا تو قیامت کے روز اسے خوف زدہ کروں گا“۔ [ابن حبان والبیہقی]

اسی خوفِ خدا کا نتیجہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ باوجودے کہ آپؐ بخشے بخشائے تھے، سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتے تھے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نماز میں مشغول تھے:

«وَلِجَوْفِهِ أَزِيزٌ كَأَزِيزِ الْمِرْجَلِ». [سنن النسائي]

”اور آپ کے سینے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے ہانڈی کے اُبلنے کی آواز ہوتی ہے، یعنی آپ رو رہے تھے“۔ [نسائی شریف]

یہ حالت تھی سید الاولین والآخرینؐ کی، آپ کبھی کبھی دوسروں کو قرآن کی تلاوت کا حکم فرماتے اور سنتے ہوئے آپؐ کی آنکھیں اشک بار ہوجاتیں۔ (صلوات اللہ وسلامہ علیہ)

اپنا محاسبہ

کیا کبھی ہم نے بھی اپنا محاسبہ کیا؟ کیا کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اپنے گناہوں پر آنسو بہائے، کیا اللہ کے خوف سے دل پر اثر ہوا اور نم دیدہ ہوے؟ اللہ پاک نے جو بے شمار نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ان کو یاد کر کے جذبۂ شکر سے آنکھیں اشک بار ہوئیں؛ موت کو یاد کر کے اور موت کے بعد آنے والے مراحل کو ذہن میں رکھ کر کبھی ہمیں اپنے گناہوں کی وجہ سے برے انجام کا خوف دامن گیر ہوا؟ اگر ایسا ہے تو اللہ کا شکر ادا کریں اور ثابت قدمی کی دعا کرتے رہیں؛ اگر ایسا نہیں، تو پھر ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہاں کی بے راہ روی اور ناعاقبت اندیشی خدانخواستہ آخرت کی ناکامی کا ذریعہ نہ بن جائے —— خوش خبری اور بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جنھیں اللہ کے دربار میں پیشی کے خوف نے نفس پرستی سے بچا رکھا ہے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِۦ وَنَهَى ٱلنَّفْسَ عَنِ ٱلْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾ فَإِنَّ ٱلْجَنَّةَ هِيَ ٱلْمَأْوَىٰ ﴿٤١﴾﴾ [النازعات: ٤٠ – ٤١]

”لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا تھا، اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکتا تھا، تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے“۔

[سورۂ نازعات: ۴۰-۴۱]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اور خوفِ آخرت

علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ عید کی نماز سے حضرت عمر بن عبد العزیز فارغ

ہوے تو شاہانہ سواری تیار کی گئی اور انہیں خبر دی گئی کہ تشریف لائیں، انہوں نے جب یہ کروفر دیکھا تو فرمایا: "اس کو مجھ سے دور کرو، میں تو مسلم معاشرے کا ایک ادنیٰ فرد ہوں"۔ آخرت کے خوف کا یہ حال تھا کہ ایک بار قبرستان سے گزرے تو سنت کے مطابق قبرستان والوں کو سلام کیا، پھر فرمایا: "ان قبروں میں کتنے حسین رخسار والے اور سرگیں آنکھوں والے مدفون ہیں..."، مزید کہا: "ایسا لگ رہا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھایا ہو نہ پیا ہو، نہ انہیں اپنے گھروں سے کوئی نسبت رہی ہو، نہ ہی محلات تعمیر کیے ہوں"، اس کے بعد بآواز بلند قبروں کو مخاطب کر کے کہا: اے موت! بتا تو سہی، تم نے دوستوں اور پیاروں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ پھر خود ہی جواب دیا اور کہا: تم جانتے ہو موت کا جواب؟ تو لوگوں نے کہا: نہیں، تو فرمایا: موت کہتی ہے کہ میں نے ان کی آنکھیں دھنسادی ہیں، ان کے حسین رخساروں کا گوشت نکال لیا ہے، ہتھیلیوں کو کلائیوں سے جدا کر دیا ہے، قدموں کو پنڈلیوں سے اور پنڈلیوں کو گھٹنوں سے الگ کر دیا ہے۔ یہ کہ کر اس قدر روئے کہ بے ہوشی طاری ہوگئی۔ یہ اس خدا ترس عالم وزاہد، جلیل القدر تابعی اور مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا حال تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جس وقت وہ عظیم ترین سلطنت کے مالک تھے، لیکن اسی کے ساتھ عدل وانصاف اور زہد وقناعت کے پیکر بھی تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور خشیت الٰہی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اللہ کے خوف سے اس قدر روتے تھے کہ دونوں آنکھوں کے نیچے آنسو بہانے کی

وجہ سے گہرے نشانات نالی کی طرح بن گئے تھے، فرمایا کرتے تھے:

"اے اللہ کی نافرمانی کرنے والے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے والے! گناہ کے انجام سے بے پرواہ مت ہوجاؤ، یہ یاد رکھو کہ گناہ کے ساتھ جو چیز لگی ہوئی ہے وہ خود گناہ سے زیادہ بدترین ہے، گناہ کا ارتکاب کرتے وقت دائیں بائیں مامور فرشتوں سے حیا نہ کرنا خود گناہ سے بڑا جرم ہے، گناہ کا موقع ہاتھ آجانے پر خوش ہونا، خود گناہ سے بڑا جرم ہے، کسی گناہ کے ہاتھ نکل جانے پر غم زدہ ہونا، اس گناہ سے بڑا جرم ہے، گناہ کو انجام دیتے وقت تمہارا اس ہوا کے جھونکے سے خوف زدہ ہونا جو دروازے کے پردے کو اڑادے، اور خدائے ذوالجلال جو تمہیں دیکھ رہا ہے اس کے خوف سے دل میں حرکت پیدا نہ ہونا یہ خود گناہ سے بڑا جرم ہے..." (الحلیۃ لابی نعیم)

حضرت ابن عباسؓ صرف ناصح اور واعظ نہیں تھے، بلکہ جو کچھ کہتے تھے، اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے تھے، چناں چہ حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں کہ ایک بار مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک میں حضرت عبداللہ بن عباس کا ہم سفر تھا، جب کسی جگہ ہم پڑاؤ ڈالتے تھے تو رات میں تکان کی وجہ سے سارے لوگ سوجاتے تھے، جب کہ حضرت ابن عباسؓ کھڑے ہوکر نماز میں مشغول ہوجاتے تھے — کہتے ہیں کہ ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس آیت کو بار بار پڑھ رہے ہیں اور رو رہے ہیں، رونے کی وجہ سے ہچکیاں بندھ جارہی تھیں، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، وہ آیت یہ تھی:

﴿وَجَآءَتۡ سَكۡرَةُ ٱلۡمَوۡتِ بِٱلۡحَقِّۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنۡهُ تَحِيدُ ١٩﴾

[ق: ۱۹]

”اور موت کی سختی سچ مچ آنے ہی والی ہے۔ (اے انسان!) یہ وہ چیز ہے
جس سے تو بدکتا تھا“۔ [سورۂ ق:۱۹]

قابلِ رشک مکانات

وہ مکانات قابل رشک ہیں جن میں قرآنِ پاک کی تلاوت کی جاتی ہے، دینی تعلیم کا مذاکرہ ہوتا ہے، راتوں کو اٹھ کر تہجد میں لمبی لمبی رکعتیں ادا کی جاتی ہیں، جن گھروں میں پوری رات باری باری اس طرح نماز ادا کی جاتی ہے کہ رات کا کوئی حصہ نہیں گزرتا جس میں کوئی نماز میں مشغول نہ ہو، ایک حصے میں اولادیں نماز پڑھ رہی ہیں، دوسرے میں والد، تیسرے میں والدہ، اس طرح وہ مکانات واقعی مبارک باد کے قابل ہوتے ہیں، بلکہ یہ ”بیوتِ مطمئنہ“ رشکِ ملائکہ ہوتے ہیں، گھر والوں کو احکم الحاکمین کے سامنے پیشی کے خوف نے اور اس کی محبت وشوق نے نماز وتلاوت اور ذکر واستغفار میں نہ صرف مشغول کردیا ہے؛ بلکہ اس کی حلاوت نے انہیں مسحور کردیا ہے۔

ایک تابعی حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو دیکھا کہ وہ چاشت کی نماز ادا کررہی ہیں، اور سورۃ الطور کی اس آیت کی تلاوت کررہی ہیں اور رو رہی ہیں:

﴿فَمَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَىٰنَا عَذَابَ ٱلسَّمُومِ ﴿٢٧﴾ إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْبَرُّ ٱلرَّحِيمُ ﴿٢٨﴾﴾ [الطور: ٢٧ – ٢٨]

”آخر اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا، اور ہمیں جھلسانے والی ہوا کے عذاب سے بچالیا۔ ہم اس سے پہلے اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ

وہی ہے جو بڑا محسن، بہت مہربان ہے"۔[سورۂ طور: ۲۷-۲۸]

کہتے ہیں کہ میں ان کو اسی حال میں چھوڑ کر بازار چلا گیا، جب واپس آیا تو دیکھا کہ اسی رکعت میں وہی آیتیں بار بار پڑھ رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔[ابن ابی حاتم]

خوفِ خدا کی علامات

فقیہ ابواللیثؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دل میں اللہ کا خوف ہو گا تو سات امور میں اس کی علامات ظاہر ہوں گی:

(۱) زبان۔ لہٰذا زبان کو جھوٹ، غیبت اور فضول گفتگو سے محفوظ رکھے گا اور ذکر و تلاوت اور کار آمد کلام سے معمور رکھے گا۔

(۲) پیٹ ہے، اس میں صرف حلال غذا داخل کرے گا، حرام سے مکمل پرہیز کرے گا۔

(۳) نگاہ کی حفاظت۔ یعنی ہر ناجائز اور حرام چیز کے دیکھنے سے اس کی حفاظت کرنا۔

(۴) ہاتھ کو حرام اور ناجائز مقاصد کے لیے قطعاً استعمال نہ کرنا۔

(۵) اپنے قدم کو صرف طاعات اور جائز و مباح امور میں استعمال کرنا اور معصیت کی طرف قدم نہ بڑھانا۔

(۶) اپنے دل کے معاملے میں اللہ سے ڈرنا اور اس کے اندر سے کینہ، حسد، بغض، ریا، تکبر اور دیگر برائیوں کو نکالنا۔

(۷) طاعات کے باب میں بھی ڈرتے رہنا کہ وہ خالص اللہ ہی کے لیے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں شرف قبولیت حاصل کر سکیں۔

مہربان رب کی رحمت سے مایوس نہ ہو

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عذاب دینا نہیں چاہتے، بندہ اگر اپنے گناہوں سے تائب ہوکر اس کی طرف بڑھتا ہے تو وہ بے حد خوش ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں رسولِ اکرم ﷺ نے بیان فرمایا کہ ایک شخص جنگل میں تھا، اس کی سواری کا جانور ساتھ تھا، اس پر اس کا سارا ساز وسامان تھا، وہ کھوگیا، اب یہ شخص مایوس ہوکر ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گیا، اپنی زندگی سے بھی مایوس ہوگیا تھا، کیوں کہ اس کے پاس کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہ تھا، ابھی لیٹا ہی تھا کہ اچانک وہ جانور اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا، اس وقت اس بندے کو جتنی خوشی ہوئی ہوگی اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتے ہیں جو توبہ کرلیتا ہے۔ [مفہوم حدیث مسلم شریف]

جن لوگوں نے گناہ کے گٹھر اپنے کاندھوں پر لاد لیے ہیں، اپنی جانوں پہ ظلم کیا ہے، زمین وآسمان کو گناہوں سے بھر دیا ہے، انھیں بھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف بلاتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ: ”میرے بندو! میری رحمت سے مایوس نہ ہو“، ایسا مہربان رب کہ بندہ جب اس کی طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے، جب ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو وہ ایک باع بڑھتا ہے، جب وہ اللہ کی طرف چل کے آتا ہے تو وہ تیزی سے اس کی طرف آتا ہے۔ [بخاری شریف]

ہمارا رب ”شدید العقاب“ بھی ہے اور ”غفور رحیم“ بھی ہے، لہٰذا اس کے عذاب سے خوف اور اس کی رحمت سے امید کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں، تاکہ خوف کی وجہ سے معصیت سے بچ سکیں اور امید کی وجہ سے دل کی گہرائیوں سے اللہ سے محبت کریں۔

* * *

۱۰/صفر/۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام بخاریؒ ـــــ شخصیت وکارنامے

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ».

[صحیح مسلم]

”جب انسان کی وفات ہوجاتی ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، تین اعمال کے علاوہ: صدقۂ جاریہ، یا ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جائے، یا ایسی نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے“۔[مسلم شریف]

اس حدیث پاک میں ایسے تین اعمال کا ذکر ہے جو انسان کے مرنے کے بعد بھی اس کو نفع پہنچاتے ہیں، حالاں کہ وفات ہوتے ہی اس کی عملی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، اب وہ کوئی کام نہیں کرسکتا، لیکن ان تین طرح کے اعمال کا فائدہ اس وقت بھی پہنچتا رہتا ہے، ان تین اعمال میں سے ایک ”عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ“ ہے، یعنی انسان ایسا علم چھوڑ کر مرے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں جس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے

کہ ایسی کتاب کی تالیف یا تصنیف کر کے مرے جس سے لوگ دنیا اور آخرت کی رہنمائی حاصل کرتے رہیں، جس کے ذریعہ اللہ رب العزت کی معرفت حاصل کریں، شریعت کے احکام معلوم کر سکیں اور اس کی روشنی میں پاکیزہ زندگی گزار سکیں۔

مشہور ترین امامِ حدیث

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، تب سے ہی جن قدآور اور بلند پایہ اہل علم کے نام نہایت احترام و تکریم کے ساتھ ہماری سماعت سے ٹکرانے لگے ان میں سر فہرست امام المحدثین محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کا اسم گرامی تھا، بلکہ بخاری کا لفظ سنتے ہی اول وہلہ میں ذہن میں امام بخاری اور ان کی صحیح البخاری کی طرف ذہن منتقل ہوتا، محدثین کے سرخیل، احادیث جمع کرنے کے لیے تن من دھن کی قربانی دینے والے، اس کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے والے، تلاش احادیث میں سب سے زیادہ سفر کرنے والے، اس کے لیے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنے والے، زہد و تقویٰ اور صلاح و نیکوکاری میں اپنی مثال آپ، حضرت امام بخاریؒ کی شخصیت ایسی ہے جسے مسلمانوں کا ہر بچہ، جوان، بوڑھا اور مرد و عورت سب اسی طرح جانتے ہیں جس طرح ایک کنبے کے لوگ اپنے افراد کو جانتے ہیں، کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ان کے لیے رحمت کی دعا نہ کی جارہی ہو۔

کتاب اللہ کے بعد افضل ترین کتاب

امام بخاریؒ نے جو علم اپنے پیچھے چھوڑا ہے، جو کتاب انہوں نے امت کو دی ہے اور

تالیف فرمائی ہے؛ کتاب اللہ کے بعد اس سے وقیع، اہم اور افضل کتاب کوئی نہیں، مسلمان، صحیح البخاری پر کسی کتاب کو اگر فوقیت دیتے ہیں تو وہ صرف اللہ کی کتاب، قرآن کریم ہے۔ نہایت جاں فشانی اور عرق ریزی کے بعد اور بارگاہِ ایزدی میں گریہ وزاری کرکے انہوں نے اپنی «الجامع المسند الصحیح» جمع فرمائی، امت کے سامنے اخلاص وللّٰہیت کے مشک وعنبر میں ڈھلی ہوئی ایسی کتاب پیش کی جس کی کوئی نظیر اب تک نہیں آسکی، جس نے انہیں ''امیر المؤمنین فی الحدیث'' کے مرتبے پہ بھرپور استحقاق کے ساتھ فائز کیا۔

امام بخاریؒ کے چند نمایاں اوصاف

امام بخاریؒ کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی، ان کے بچپن میں ہی ان کے والد گرامی اس دنیا سے چل بسے، پھر ان کی والدہ ماجدہ نے ان کی تربیت کی، صرف سولہ سال کی عمر میں اپنے دور کی مشہور ترین کتابیں پڑھ چکے تھے، کہا جاتا ہے کہ بچپن میں ہی انہوں نے ستر ہزار حدیثیں حفظ یاد کرلی تھیں۔

مالی اعتبار سے نہایت خوش حال تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد ماجد نے ترکے میں بہت کچھ چھوڑا تھا، چناں چہ امام بخاریؒ ''مضاربت'' کے ذریعے اس میں اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مادی اعتبار سے بھی اسی طرح فائق ہوگئے جس طرح معنوی اعتبار سے فائق تھے۔ (مضاربت کا معاملہ اس طرح ہوتا ہے کہ دو شخص تجارت میں اس طرح شریک ہوں کہ ایک شخص کا مال لگے اور دوسرے کی محنت اور وقت، پھر نفع اور نقصان میں دونوں متعیّنہ حصص میں شریک ہوں)۔

محدثین کرام کی تاریخیں لمبے اسفار، زہد وقناعت، محنت ومشقت، حفظ احادیث

اور تقویٰ وطہارت سے بھری پڑی ہیں، جنہوں نے دین اسلام کی عظیم عمارت کھڑی کرنے اور اسے پائیدار بنانے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں — امام بخاریؒ کو بھی اللہ نے اپنے وقت کا بڑا عابد وزاہد، متواضع، فراخ دست اور تقویٰ شعار بنایا تھا۔

علمائے کرام اور طلبہ و مجاہدین پر بے دریغ اپنا مال خرچ کرتے تھے، اپنے مالِ خاص سے فوجی چھاؤنی، قلعے اور دینی مدارس بنواتے اور لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر کے سرگرمِ عمل کر دیتے تھے، سخاوت اور مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی تین تین سو افراد ان کے دسترخوان پر ہوتے اور ان کی ضیافت سے مستفید ہوتے۔

علم وعمل اور بالخصوص علمِ حدیث اور تقویٰ وپرہیزگاری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا جاہ وجلال اور مرتبہ ومقام اور قبول عام عطا فرمایا کہ جب کسی گاؤں یا شہر میں ان کی آمد ہوتی تو ان کے استقبال کے لیے وہاں کے حکام، ذمہ داران، علماء وصلحاء اور عوام وخواص سب نکل پڑتے اور دور سے ہی ان کا استقبال کر کے نہایت شان کے ساتھ آبادی میں لاتے، پھر اہل علم کا ان کی قیام گاہ پہ ہجوم لگا رہتا تھا، ان کی گفتگو سننے اور ان سے علم حدیث حاصل کرنے کے لیے لوگ اس طرح ٹوٹ پڑتے تھے جس طرح پروانے شمع کے اوپر۔

امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ:

> ”امام بخاریؒ ایک مرتبہ سمرقند تشریف لائے تو چار سو (۴۰۰) علمائے حدیث ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کا امتحان لینے کے لیے ملک شام کی سندوں کو عراق کی سندوں میں شامل کر دیا، پھر اسناد میں بھی جو رواۃ تھے ان

میں بھی خلط ملط کر دیا، اسی طرح بعض احادیث کے متن کو ذکر کر کے ان کے ساتھ دوسری سندیں لگادیں، اس کے بعد امام بخاریؒ کے سامنے ان کو پڑھا تو انہوں نے پہلے ان سب سے لاعلمی کا اظہار کیا، کیوں کہ ان کی ترتیب غلط تھی؛ لیکن فوراً ہی ان تمام احادیث کو ان کی صحیح سندوں کے ساتھ ذکر فرمادیا، یعنی ہر ہر حدیث کو دوبارہ ذکر فرما کر اس کے ساتھ اس کی صحیح سند ذکر فرمائی جسے سن کر علمائے حدیث دنگ رہ گئے اور عش عش کرنے لگے"۔

کہتے ہیں کہ امام بخاری کسی کتاب کو ایک بار دیکھ لیتے تو وہ کتاب حفظ ہوجاتی۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

"سرزمین خراسان نے ان جیسی شخصیت پیدا نہیں کی"۔

علم حدیث میں ایسا کمال پیدا کیا کہ ایک محدث کہتے ہیں:

"جس حدیث کے بارے میں امام بخاری یہ کہہ دیں کہ یہ میرے علم میں نہیں تو وہ حدیث ہی نہیں"۔

شیخ احمد بن حمدون کہتے ہیں کہ میں نے امام مسلم بن حجاج کو دیکھا کہ وہ امام بخاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دے کر عرض کیا: اے استاذوں کے استاذ، محدثین کے سردار، عِلَلِ احادیث کے طبیب! مجھے اجازت دیجیے کہ آپ کے پاؤں کا بوسہ لوں۔ پھر "کفارۂ مجلس" والی حدیث سے متعلق دریافت کیا تو امام بخاریؒ نے اس کی "علت" بیان فرمائی۔ جب مجلس برخاست ہونے لگی تو کہا:

"آپ سے نفرت صرف اسے ہوگی جو آپ سے حسد کرتا ہو، اور میں گواہی

دیتا ہوں کہ دنیا آپ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے"۔

امام ابن خزیمہؒ کہتے ہیں کہ:

"آسمان کے نیچے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا محمد بن اسماعیل بخاری سے بڑا عالم اور حافظ میری آنکھوں نے نہیں دیکھا"۔

احادیث پاک کے ساتھ شغف کی وجہ سے عام طور پر محدثین کرام باحیا، دلیر، سخی، زہد وقناعت کے پیکر اور متقی و پرہیزگار ہوتے ہیں، امام بخاریؒ کو بھی اللہ کی طرف سے ان بلند ترین اوصاف کا وافر حصہ ملا ہوا تھا، وہ فرماتے تھے:

«إني لأرجو أن ألقى الله، وليس أحد يطالبني أني أغتبته».

"میری یہ خواہش ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ کسی شخص کا مجھ سے یہ مطالبہ نہ ہو کہ میں نے اس کی غیبت کی ہے"۔ (یعنی اس کے غائبانہ میں اس کی برائی بیان کی ہے)۔

احترامِ علم اور عزتِ نفس

امام بخاریؒ تواضع کے پیکر تھے، لیکن علم حدیث نے ان کے اندر شاہوں سے زیادہ عزتِ نفس اور خودداری پیدا کیا تھا، تواضع اختیار کرتے تھے، لیکن ذلت کے ساتھ نہیں، اسی لیے ایک حاکمِ وقت نے جب ان کی خدمت میں اپنا نمائندہ بھیجا اور گزارش کی کہ ان کے دربار میں تشریف لاکران کے بچوں کو علم حدیث پڑھادیں، توانہوں نے جواب بھجوادیا:

"علم خود نہیں جاتا؛ بلکہ علم حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو آنا پڑتا ہے"۔

یعنی اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے فرزند علم حاصل کریں توانہیں بھیج دیں۔ اس

طرح انہوں نے علمِ حدیث کی شان کو بلند و بالا رکھا اور خود جانے سے انکار فرمادیا۔

امام صاحبؒ کے تمام علمی اسفار کی مسافت اور ان کے مشایخ کی تعداد

آج کل نقل وحمل کا نظام اتنا ترقی یافتہ ہوچکا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا لمبا سفر منٹوں اور گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے، جتنی مسافت طے کرنے کے لیے پچھلے زمانے میں ہفتے اور مہینے لگتے تھے، آج محض چند گھنٹوں ہی میں طے ہوجاتی ہے، اسی لیے آسودہ حال لوگ سیر وسیاحت کے لیے لمبے لمبے سفر کرتے ہیں اور جگہ جگہ کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں؛ لیکن امام بخاریؒ کے سارے اسفار علم حدیث کی غرض سے ہوے، اپنی زندگی کا بڑا حصہ انہوں نے احادیث کے حصول کے لیے سفر میں گزار دیا، ان کے زمانے میں یا تو پیدل سفر کیا جاتا تھا یا جانوروں کی سواری ہوتی تھی، سفر بھی نہایت پر مشقت ہوتا تھا، بعض دفعہ صرف ایک حدیث کے لیے دور دراز کا سفر فرماتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان کے تمام اسفار کو جمع کرکے ان کی مسافت کا حساب لگایا تو تقریبًا ۱۴ ہزار کلو میٹر بنتے ہیں، اسی طرح جن مشایخ سے انہوں نے علم حدیث حاصل کیا ان کی تعداد تقریبًا ۴ ہزار ہے۔ گویا کہ اس زمانے کے تمام محدثین کے پاس جتنی حدیثیں تھیں وہ سب انہوں نے اپنے حافظے میں اکٹھی کرلی تھیں۔

دن بھر ان کی فکر ونظر کا محور علم حدیث ہوتا تھا، اسی طرح رات بھی اسی مبارک مشغلے میں گزار دیتے تھے، کہا جاتا ہے کہ رات میں تھوڑا سوتے تھے، پھر بیدار ہوکر چراغ جلاتے اور کچھ لکھتے یا کسی حدیث پر کوئی علامت لگاتے، پھر سوجاتے، تھوڑی دیر میں دوبارہ کوئی علمی نکتہ ذہن میں آتا تو اٹھ جاتے، چراغ جلاتے اور لکھ لیتے، اس طرح ایک رات میں

بعض دفعہ بیس مرتبہ چراغ جلاتے اور بجھاتے — ان کے زمانے کے تمام علمائے کرام کا اجماع ہو گیا تھا کہ علم حدیث کے وہ بے نظیر استاذ اور محدث ہیں، یہاں تک کہ ان کے اپنے اساتذۂ کرام بھی ان سے رجوع کرنے لگے تھے اور نظر ثانی کے لیے اپنی مؤلفات ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

لازوال علمی ذخیرہ اور اس کے ثمرات

امام بخاریؒ نے یہ مبارک علم حدیث اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے علم میں برکت عطا فرمائی، اپنی زندگی میں بھی بارانِ علم و معرفت سے طالبانِ علومِ نبوت کو سیراب کرتے رہے اور ان کی وفات کے بعد بھی یہ فیض ابرِ کرم بن کر پورے عالم میں برستا رہا۔

ان کی علمی مجالس کا حال یہ تھا کہ کبھی کبھی ہزاروں طلبہ بیک وقت ان کے حلقۂ درس میں بیٹھتے اور ان سے علم حدیث لکھتے۔ خطیب بغدادی نے شیخ غریری سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے ساتھ تقریباً ستر ہزار لوگوں نے امام بخاری سے صحیح بخاری سنی اور اب میرے سوا ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہا۔

ان کی وفات کے بعد ان کی کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اسلامی مدرسہ یا کالج یا یونیورسٹی ایسی نہیں جس میں صحیح بخاری کی مکمل یا کچھ حصے کی تعلیم نہ ہو رہی ہو، کوئی امام یا خطیب یا اسلامیات کا معلّم و استاذ ایسا نہیں ہو گا جو امام بخاری کے لیے رحمت کی دعا نہ کرتا ہو۔

لِمِثْــلِ هَــذَا فَلْيَعْمَــلِ الْعَــامِلُوْن
وفِيْ ذلِكَ فَلْيَتَنَـافَسِ الــمُتَنَافِسُوْن

”کام کرنے والوں کو ایسے ہی کارنامے انجام دینے چاہییں اور اسی طرح کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے“۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اگر کوئی شخص دین کے لیے بھرپور کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کی کوششیں بارآور بھی کرتا ہے اور قدردانی بھی فرماتا ہے:

﴿ وَمَنْ أَرَادَ ٱلْـَٔاخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا ﴿١٩﴾ ﴾ [الإسراء: ١٩]

”اور جو شخص آخرت کا فائدہ چاہے، اور اس کے لیے ویسی ہی کوشش کرے جیسی اس کے لیے کرنی چاہیے، جب کہ وہ مومن بھی ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی“۔[سورۂ بنی اسرائیل:۱۹]

محاسنِ اسلام کا نمایاں ترین پہلو

اسلام کے تو سارے پہلو ہی نمایاں ہیں، ان ہی میں ایک خوب صورت اور حسین وجمیل پہلو یہ ہے کہ اسلام میں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، ہمارے یہاں پاپائیت نہیں؛ قومیت یا لسانیت کی بنیاد پر یہاں کسی کو فوقیت حاصل نہیں ہے، بلکہ علم وفضل اور تقوی، طہارت میں جو امتیازی شان رکھتا ہوگا وہی برتر اور قابل اکرام واحترام زیادہ ہوگا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾ ﴾

[الحجرات: ١٣]

”در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو“۔[سورۂ حجرات:۱۳]

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

چناں چہ امام بخاریؒ جیسی شخصیت جن کا تعلق خاکِ عجم سے تھا، مرکز اسلام سے دور افتادہ مقام پر پیدا ہوے، لیکن علم وفضل، پاک بازی اور تقویٰ شعاری کی وجہ سے اللہ نے انہیں ”شیخ الاسلام والمسلمین فی الحدیث“ بنایا، بلکہ ”امیر المؤمنین فی الحدیث“ کے لقب سے نواز دیا۔

کتنا عظیم ہے یہ مذہب، اور کس قدر حسین ہیں اس کی تعلیمات اور کتنے درخشاں ہیں اس کے اصول وقواعد، صحرائے عرب سے اس کی شعاعیں اٹھتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے پورے عالم میں پھیل جاتی ہیں، اس کی خوش بو سارے عالم کو معطر کر دیتی ہے، ایسا سایہ دار درخت جس کے سایے تلے ہر ایک کو پناہ ملتی ہے، ایسا مبارک مذہب جو نہ تو رنگ ونسل کی بنیاد پر تفریق کرتا ہے نہ ہی تنگ دستی اور مال داری کی بنیاد پر؛ یہی وجہ ہے کہ آپ اس کے جھنڈے کے نیچے بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ کو بھی دیکھیں گے اور اسی مقام پر فارس کے سلمانؓ اور قریش کے علیؓ کو بھی پائیں گے، ان سب کے درمیان وحدت والفت اور اخوّت ومحبت کا ایسا مضبوط رشتہ قائم کر دیا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اگر امام بخاری کی تواضع وانکساری، ان کی سخاوت وفراخ دستی، علم دوستی اور حدیث پاک کے لیے دنیا کے چپے چپے کی رحلت اور صحرا نوردی، ان کی پاکبازی اور تقویٰ شعاری تعجب خیز ہے، تو اس سے زیادہ حیرت انگیز اور فرحت انگیز اسلام کا یہ درخشاں اور روشن پہلو ہے کہ وہ بلا تفریق رنگ ونسل ہر ایک کو آگے بڑھنے اور آگے بڑھ کر ہاتھ میں ”مینا“ لینے

کا حوصلہ دینا ہے اور کسی کے لیے "احتکار" اور اجارہ داری کو روا نہیں رکھتا، اسی لیے ایک عجمی شخص کو دنیائے اسلام کا امام حدیث بنا دیا جسے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں۔

لہٰذا جو شخص دین کی اشاعت، دینی اقدار کی تبلیغ، کلمۃ اللہ کی رفعت اور اسلام اور مسلمانوں کی نصرت کے لیے قربانی دے گا، اُن کے تحفظ کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کرے گا تو ہرگز اللہ تعالیٰ اس کی کوششوں کو ضائع نہیں ہونے دیں گے، بلکہ دنیا اور آخرت کی سربلندی اور سعادت اور "حیاتِ طیبہ" مبارک اور پاکیزہ زندگی عنایت فرمائیں گے۔

امام بخاریؒ کی رحلت اور ان کے کارنامے کی مقبولیت

۲۵۶ھ میں امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ اس دنیا سے رخصت ہو گئے؛ لیکن کارنامہ ایسا چھوڑا جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر ملک، ہر شہر اور ہر گاؤں اور ہر محلے میں بلکہ مسلمانوں کے ہر گھر میں زندہ ہیں، "امام بخاری" کا لفظ اتنا مانوس اور زبان زد ہے کہ جیسے کوئی جیتی جاگتی شخصیت ہو یا گھر کا کوئی فرد ہو جسے بچے بوڑھے جوان اور مرد و عورت سب جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر پہ اپنی رحمتوں کی بارش برسائیں، ان کی مغفرت فرمائیں، انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین

❊ ❊ ❊

۱۴۲۹/۵/۱۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام کے خلاف کیے جانے والے چند اعتراضات کے جوابات

اسلام دین برحق ہے، قیامت تک اب اس کے سوا کوئی دین و مذہب انسانیت کی نجات و فلاح کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَـٰمُ ﴾ [آل عمران: ۱۹]

"بیشک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے"۔[سورۂ آل عمران:۱۹]

جو مسائل کتاب و سنت کے قطعی دلائل سے ثابت ہیں ان پر کوئی مسلمان کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کر سکتا، خواہ دشمنانِ اسلام ان کے خلاف کتنا ہی واویلا مچائیں یا لوگوں کو بھڑکائیں، ہر مسلمان کو یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ اس کے مذہب کے خلاف کیا سازشیں کی جارہی ہیں، کن مسائل کو بنیاد بنا کر شکوک و شبہات پیدا کیے جارہے ہیں، اسلام کی پرکشش اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ تعلیمات سے متأثر ہوکر بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنے والوں سے دہشت زدہ ہوکر اسلام کے خلاف پروپگنڈہ کرنے والوں کے اشکالات اور ان کے جوابات کا علم ہونا بھی ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے، تاکہ فخر کے ساتھ

اور سرفرازی کے ساتھ ہر جگہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکے۔

موجودہ دور کے مختلف قسم کے ترقی یافتہ ذرائع ابلاغ کو استعمال کرکے اسلام اور مسلمانوں کے تئیں بغض وعناد اور کینہ وحسد رکھنے والوں نے چند مسائل کو اچھال کر لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ عقل وفلسفے کے حساب سے اسلام ایک فرسودہ مذہب ہوچکا ہے، حالاں کہ در حقیقت ان ہی کی باتیں عقل ومنطق سے کوسوں دور ہیں۔ اس خطبے میں ان کے چند مشہور ترین اعتراضات کو سامنے رکھ کر ان کے مدلل اور مختصر جوابات دینے کی کوشش کی جائے گی، اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کرلیں گے کہ ان کے اعتراضات میں کتنی عقلانیت اور دَم ہے۔

حاسدین کے چند اعتراضات

بنیادی طور پر ان کے اعتراضات کا محور عورت ہے، یعنی سب سے زیادہ ان کے پیٹ میں مروڑ اس بات سے ہے کہ اسلام میں ”حقوقِ نسواں“ کی رعایت نہیں کی گئی ہے، چناچہ باپ کی وراثت میں لڑکی کا حصہ، لڑکے کی بہ نسبت آدھا مقرر کیا گیا ہے۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ مرد کو ایک سے زائد شادیوں کا حق دیا گیا ہے، وہ بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ ایک اعتراض ان کا یہ بھی ہے کہ اسلام میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے، جس سے عورت کی توہین معلوم ہوتی ہے۔ ایک بڑا اعتراض ان کا یہ ہے کہ قرآن میں مرد کو عورت کا قوّام، یعنی حاکم اور نگراں کہا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اسلام نے عورت کو مرد کے مساوی نہیں رکھا ہے، بلکہ اس کو مرد سے ادنیٰ رتبہ دیا ہے اور مرد کو فوقیت دی ہے۔

جواب سے پہلے ایک وضاحت

مذکورہ بالا اعتراضات کے جوابات سمجھنے سے پہلے یہ ذہن نشیں کرلیں کہ اسلام نے عورت کو بحیثیت عورت کے چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ قبل ہی وہ سارے حقوق عطا کیے جن کی وہ مستحق تھی، جب کہ غیر اسلامی معاشروں میں عہدِ قریب تک عورت کا کوئی خاطر خواہ مقام نہیں تھا، بلکہ ان کا تعلیم یافتہ اور دانش ور طبقہ اس بحث و مباحثے میں الجھا ہوا تھا کہ عورت کے جسم میں روح بھی ہے یا نہیں، اور اگر روح ہے بھی تو یہ انسانی روح ہے یا حیوانی؟ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس کے اندر انسانی روح ہے تو انسانی معاشرے میں اس کی حیثیت مرد کے لیے ایک لونڈی کی ہے یا اس سے تھوڑا اونچا مرتبہ ہے؟۔

جب کہ اسلام، عورت کو ایک مکمل انسان تصور کرتا ہے، اس کے اندر بالکل اسی طرح کی روح موجود ہے جس طرح مرد کے اندر ہے۔ قرآنِ کریم کا اعلان ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً﴾ [النساء: ۱]

”اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیے“۔ [سورۂ نساء:۱]

لہٰذا اصل اور پیدائش اور انجام کے اعتبار سے عورت ایک مکمل اکائی ہے، انسانیت اور بشریت میں مرد کے مساوی ہے، دونوں کے حقوق اس حیثیت سے برابر ہیں،

اس کی جان ومال، عزت وآبرو مرد کی طرح عزیز ہیں، نہ اس کی غیبت جائز ہے، نہ اس کے خلاف جاسوسی روا ہے، نہ اس کا مذاق اڑانے اور اس کو عیب لگانے کی اجازت ہے، ان تمام امور میں مرد وزن دونوں برابر کے شریک ہیں، جیسا کہ سورۃ الحجرات میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ».

[رواہ مسلم]

”ہر مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت وآبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے“۔[مسلم شریف]

اسی طرح دنیاوی معاملات میں دونوں صنفوں کو تصرف کا یکساں حق حاصل ہے، مثال کے طور پر خرید وفروخت، رہن، اجارہ، وقف وغیرہ۔ قرآنِ کریم کا صاف صاف اعلان ہے:

﴿لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا ٱكْتَسَبُوا۟ ۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا ٱكْتَسَبْنَ ۚ﴾ [النساء: ٣٢]

”جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے“۔[سورۂ نساء:۳۲]

حقوق وواجبات میں اختلاف کی وجہ

اوپر عورتوں کو اسلام کی طرف سے دیے گئے حقوق کا ذکر مختصر طور پر کیا گیا، لیکن

سوال یہ ہے کہ کیا بغیر کسی تفریق کے مکمل طور پر عورت اور مرد کے درمیان مساوات ممکن ہے ؟ یا بعض حقوق وواجبات میں کچھ فرق ہے ؟ اگر دونوں کے صنف میں اور وظائف میں کوئی اختلاف نہ ہو تو یقیناً بلا تفریق دونوں کے حقوق وواجبات یکساں ہوں گے ، اسی طرح اگر دونوں کی جسمانی ساخت ، وجدانی شعور اور زندگی کے وظائف میں کوئی فرق نہ ہو تو حقوق وواجبات میں بھی کوئی فرق نہیں ہوسکتا ؛ لیکن اگر دونوں کے صنف ، وظائف ، شعور ووجدان اور جسمانی تکوین میں فرق ہے اور یقیناً ہے تو حقوق وواجبات میں بھی فرق ہونا یقینی ہے ، اور یہی عین عدل وانصاف ہے ۔ انسانیت اور بشریت میں اور اس حیثیت سے ان کے اعزاز واکرام میں مساوات کا ہونا فطری امر بھی ہے اور معقول بھی ہے ، کیوں کہ دونوں ایک ہی نفس سے وجود میں آئے ہیں ، لیکن کارگہِ حیات میں دونوں کے وظائف اور اس کے طریقۂ کار میں مساوات کی کوشش یا دعویٰ یا مطالبہ کرنے کا مطلب ہے خلافِ فطرت وطبیعت امر کا مطالبہ کرنا ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مرد وہ مخصوص کام انجام دینے لگے جو ایک عورت انجام دیتی ہے ، مثال کے طور پر حمل ، ولادت اور رضاعت وغیرہ ؟ اگر ایسا ممکن نہیں تو یہ فطری بات ہے کہ دونوں کے حقوق وواجبات میں بھی فرق ہوگا ۔

باپ کی وراثت میں لڑکی کا حصہ بہ نسبت لڑکے کے آدھا کیوں ؟

اس مختصر سی تمہید اور وضاحت کے بعد اب آتے ہیں ان کے اعتراضات اور جوابات کی طرف ۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے احکامِ وراثت کے ضمن میں فرمایا :

﴿ يُوصِيكُمُ ٱللَّهُ فِيٓ أَوۡلَٰدِكُمۡۖ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ ٱلۡأُنثَيَيۡنِۚ ... ﴾ [النساء: ١١]

”اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے...“۔[سورۂ نساء:۱۱]

اس حکم پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ ایک مرد کا حصہ بہ نسبت عورت کے دہرا رکھا گیا ہے جو عدل وانصاف کے خلاف ہے۔

ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے اس کا جواب سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی: ایک باپ نے اپنے دو لڑکوں کو ایک کام کرنے کا حکم دیا: بڑے لڑکے کو کہا کہ تم ایک ماڈل کی فلاں کمپنی کی دو گاڑیاں خرید کر لاؤ اور دوسرے لڑکے کو حکم دیا کہ تم اسی ماڈل اور اسی کمپنی کی ایک گاڑی خرید کر لاؤ، پھر بڑے لڑکے کو دس لاکھ روپے دیے اور دوسرے چھوٹے لڑکے کو پانچ لاکھ روپے دیے، کیوں کہ ایک گاڑی کی قیمت پانچ لاکھ تھی۔ سوال یہ ہے کہ ایک لڑکے کو دس لاکھ دینا اور دوسرے کو پانچ لاکھ دینا عدل وانصاف کے مطابق ہے یا اس کے خلاف ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی یہی کہے گا کہ یہ عین عدل ہے، اس میں کوئی ناانصافی نہیں ہے، کیوں کہ جسے دس لاکھ دیے گئے اس سے مطالبہ زیادہ اور جسے پانچ لاکھ دیے گئے اس سے مطالبہ کم ہے — ٹھیک اسی طرح وراثت کا معاملہ ہے، مرد کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں، شریعت اس کو مکلف کرتی ہے کہ وہ اپنا، اپنی بیوی کا اور اپنی اولاد کا نفقہ خود ہی برداشت کرے، ان کی روٹی، کپڑے اور مکان کا ذمہ دار مرد ہی ہوگا، جب کہ عورت پر اس طرح کی کوئی ذمے داری نہیں، نہ اپنے شوہر پر خرچ کرنے کی ذمہ دار ہے، نہ اپنی اولاد کے اوپر، بلکہ وہ کروڑ پتی بھی ہو جائے پھر بھی شریعت یہی کہتی ہے کہ شوہر ہی اس کے نفقے کا ذمے دار ہے —ایسی صورتِ حال میں اگر شریعت نے مرد کو دُہرا حصہ دیا ہے تو اس میں ناانصافی کہاں ہے؟ مسئلہ دراصل حساب کا ہے نہ کہ جذبات کا۔ مزید یہ کہ اس حکم کا تعلق

صرف وراثت کے مال سے ہے جو ورثہ کو بغیر کد وکاوش کے ملتا ہے، لیکن اگر عورت تجارت کرے، یا ملازمت کرے یا کسی اور مباح ذریعے سے مال کمائے تو یہاں کوئی تفریق نہیں، وہ اپنے مال میں تصرف کا مکمل حق رکھتی ہے، اس کے مال کی ملکیت میں کوئی شریک نہیں اور وہ شریعت کی طرف سے کسی پر خرچ کرنے کی پابند بھی نہیں۔

دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَٱسْتَشْهِدُوا۟ شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَٱمْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَىٰهُمَا ٱلْأُخْرَىٰ ۚ﴾ [البقرة: ٢٨٢]

”اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو، ہاں اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہو جائیں جنہیں تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے“۔[سورۂ بقرۃ:۲۸۲]

جس آیت کریمہ کا یہ جزو ہے اسے ”آیۃ المداینۃ“ کہتے ہیں، یعنی معاملات سے متعلق آیت، معاملات اور کاروبار میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے مُساوی ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ عام طور پر کاروبار مرد ہی کرتے ہیں، بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ کمائیں اور عورت پر خرچ کریں، لہٰذا چوں کہ عورتیں معاملات سے دور رہتی ہیں، اس لیے ان امور سے انہیں واقفیت بھی مردوں کے بہ نسبت کم ہوتی ہے، نیز عورت کی طبیعت

میں جذباتیت، انفعالیت رکھی گئی ہے، اندیشہ ہے کہ کسی قضیے سے متأثر ہوکر جذبات کی بنیاد پر کوئی گواہی دے دے، لیکن اگر دو ہوں گی تو یہ امکان کم ہو گا، کیوں کہ ضروری نہیں کہ دونوں بیک وقت جذباتی بن جائیں، لہٰذا دوسری اسے تنبیہ کردے گی اور صحیح گواہی پر آمادہ کرے گی ـــ اس کا قطعًا یہ مفہوم نہیں ہے ک اسلام میں عورت کا درجہ مرد کے مقابلے میں آدھا ہے، چناں چہ کچھ مقامات ایسے ہیں، جہاں صرف عورت کی گواہی معتبر مانی گئی ہے، مثال کے طور پر ولادت، استہلال (بچے کا پیدا ہوتے ہی رونا یا چھینکنا یا چیخنا جس سے زندہ پیدا ہونے کا علم ہو جس پر وراثت وغیرہ کے احکام مرتب ہوتے ہیں) رضاعت، کپڑوں کے اندر کے عیوب اور عدت کا ختم ہونا وغیرہ، یہ وہ امور ہیں جن میں صرف عورت کی گواہی معتبر ہے، یہاں تو سرے سے مرد کی گواہی معتبر ہے ہی نہیں، کیا یہ مرد کے لیے باعث توہین اور موجب عار ہے؟ قطعًا نہیں ـــ اگر آپ سورۂ نور کی تلاوت کریں گے تو پتہ چلے گا کہ ’’لِعان‘‘ میں عورت کی گواہی بالکل مرد کے مساوی ہے۔ اس لیے شریعت کے کسی ایک جزو کو لے کر اس کی حکمت کو سمجھے بغیر اور شریعت کی وسیع معلومات کے بغیر اعتراض کرنا یا تو کینہ وحسد کی بنیاد پر ہے یا جہالت کی بنیاد پر۔

مرد کو عورت کا نگراں بنایا گیا ہے

ایک اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام نے مردوں کو عورتوں کا حاکم اور نگراں بنا کر عورتوں کی توہین کی ہے، قرآنِ کریم میں ہے:

﴿ٱلرِّجَالُ قَوَّٰمُونَ عَلَى ٱلنِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ ٱللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَآ أَنفَقُوا۟ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ ...﴾ [النساء: ٣٤]

”مرد عورتوں کے نگراں ہیں، کیوں کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور کیوں کہ مردوں نے مال خرچ کیے ہیں...“۔

[سورۂ نساء:۳۴]

معترضین کہتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں کا نگراں کیوں بنایا گیا ہے، اس کے برعکس عورتوں کو مردوں کا نگراں کیوں نہیں بنایا گیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ پہلی صورت میں اگر اشکال ہوسکتا ہے تو دوسری صورت میں بھی تو ہوسکتا ہے؟ پھر مسئلے کا حل تو نہیں نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، انسانی فطرت کے خلاف کوئی حکم نہیں دیتا، کوئی فیملی ہو، یا خاندان ہو یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کمپنی ہوتی ہے، یا کوئی ادارہ ہوتا ہے، ہر ادارے کو چلانے کے لیے ایک ذمے دار کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح مرد و عورت کے ذریعے جو شراکت پیدا ہوئی ہے، پھر اس ازدواجی تعلق کی بنیاد پر نسل وجود میں آتی ہے، اس کے مصارف اور دیگر ضروریات سامنے آتی ہیں، ان کے لیے فیملی میں ایک سرپرست ہونا ضروری ہے، جس طرح کمپنیوں اور دنیا کے تمام چھوٹے بڑے اداروں میں سرپرست ونگراں اور مدیر کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ایسا نہ ہو تو بدنظمی اور لاقانونیت پیدا ہوتی ہے جس کا خسارہ ہر ایک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

مفروضہ تین شکلیں

پہلے ذکر کیا گیا کہ اگر کوئی فیملی کا ذمہ دار نہ ہو تو گھر میں بدنظمی پیدا ہوجائے گی، اب اس ذمے داری اور نگرانی کے لیے تین صورتیں ہوسکتی ہیں: یا تو عورت کو ذمے دار بنایا جائے، یا مرد کو یا پھر دونوں کو۔ تجربے اور حقائق اور اصول وقواعد بتاتے ہیں کہ یہ تیسری

صورت ناقابل قبول اور ناقابل عمل ہے، اس لیے کہ قرآنِ کریم نے زمین وآسمان کے نظام کے سلسلے میں کہا:

﴿ لَوۡ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَاۚ ﴾ [الأنبياء: ۲۲]

"اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہوجاتے"۔[سورۂ نساء:۲۲]

اگر دو وہمی خداؤں کی ریاست وحاکمیت کا نتیجہ یہ ہوتا تو عام انسان اگر اسی بدنظمی والے اصولوں پر چلے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ بلاشبہ آپسی لڑائی، بدنظمی اور ہر وقت کی بدمزگی وجود میں آئے گی جس کا بدترین اثر بچوں پہ پڑے گا، اسی لیے ماہرینِ علم نفسیات کہتے ہیں کہ جو بچے ایسے والدین کے زیر سایہ تربیت پاتے ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے اپنی بات منوانا چاہتے ہیں، آپس میں اختلاف ونزاع کی کیفیت میں رہتے ہیں، لڑتے بھڑتے رہتے ہیں، وہ بچے مختلف قسم کی ذہنی پیچیدگیوں اور نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔

باقی رہ گئے دو مفروضے، ان کی بحث میں جانے سے پہلے ایک سوال کا صحیح جواب مل جائے تو مسئلہ حل ہوجائے گا، سوال یہ ہے کہ سرپرستی اور نگرانی اور حاکمیت کے لیے فکر ونظر اور دوررسی اور قوتِ فیصلہ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے یا انفعالیت، جذباتیت اور نرم ونازک طبیعت کی؟ اگر اس کا جواب آپ کے پاس ہے تو مزید کسی بات کی ضرورت نہیں رہ جاتی، کیوں کہ خالقِ کائنات نے مرد کی تخلیق میں ہی سخت جانی، جفاکشی، دوررسی اور قوتِ فیصلہ بہ نسبت عورت کے زیادہ رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ سلیم الفطرت عورت بھی اس مرد کو احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھتی جس کے اندر مذکورہ دلیرانہ صفات نہ ہوں، وہ یہ چاہتی ہے کہ مرد ایسا ہو جو عورت کا اور بچوں کا تحفظ کرسکے، اور عام طور پر مردوں میں یہ صفات ہوتی

ہیں، جب کہ عورت کی صنف میں نزاکت، تاثراور "عاطفیت" رکھی گئی ہے، نیز یہ کہ مرد کو ہی شریعت نے عورت کے نان ونفقے کا، اس کی رہائش کا، بلکہ ان دونوں سے وجود میں آنے والی نسل کے پورے نفقے کا ذمہ دار بنایا ہے، ان تمام پہلوؤں پر اگر غور کیا جائے تو اس "شرکۃ الحیاۃ" کا مُدیر اور سرپرست مرد ہی ہو سکتا ہے۔

اسلام میں مرد کے لیے ایک سے چار تک بیویوں کی اجازت کیوں؟

عام طور پر اس اعتراض کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات اور اسلامی تعلیمات کے تئیں نفرت کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام میں ایک مرد کو ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی اجازت کیوں دی گئی ہے، یہاں تک کہ ایک مرد بیک وقت چار بیویاں بھی رکھ سکتا ہے، کیا اس سے عورتوں کی توہین نہیں ہوتی؟

یہاں بھی ہم اعتراض کرنے والوں سے ایک سوال کرتے ہیں اور اس کا تشفی بخش اور معقول جواب طلب کرتے ہیں: ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ کسی شہر میں بائیس لاکھ انسانوں کی آبادی ہے جس میں دس لاکھ مرد ہیں اور بارہ لاکھ عورتیں ہیں، ہر مرد نے ایک ایک عورت سے شادی کرلی تو دو لاکھ عورتیں بغیر شادی کے رہ گئیں، ان دو لاکھ عورتوں کے مسئلے کا حل آپ کے پاس کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے مرد وزن دونوں کے اندر صنفی خواہشات رکھی ہیں، اسی طرح ہر ایک کے دل میں اولاد کی خواہش بھی رکھی ہے کہ ان کی اپنی اولاد ہو، جس کی تربیت کریں اور اس سے دل بہلائیں، پھر بڑی ہو کر ان کا سہارا بھی بنیں، بالخصوص عورتوں کے اندر یہ خواہش مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان دو لاکھ عورتوں کے مسائل کا شریفانہ، منصفانہ اور باعزت

حل سوائے اسلام کے اور کسی کے پاس نہیں ہے، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ جو خوش حال ہوں، استطاعت رکھتے ہوں وہ ایک سے زائد عورتوں سے شادی کرسکتے ہیں، اور تمام بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ ہر ایک کے حقوق ادا کرتے ہوئے ان کی تمام ضروریات کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر ڈال کر انہیں عزت کی زندگی دے کر اس مسئلے کو آسانی سے حل کرسکتے ہیں۔

لیکن جو لوگ ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں دیتے، ان کے یہاں ان عورتوں کا جو تعداد میں مردوں سے زیادہ ہوں کیا حل ہے؟ ایک حل یہ ہے کہ عورت اپنی عزت وآبرو کو بازاروں میں نیلام کرے۔ ایک حل یہ ہے کہ نفس پرستوں کی ہوس کا شکار ہوکر سیکڑوں مردوں کی ہوس پوری کرتی رہے اور عمر ڈھلنے پر اسے استعمال کیے ہوئے ٹیشو پیپر کی طرح پھینک دیا جائے، اور اگر بہت خود دار اور غیرت مند ہوگی تو اپنی فطری اور صنفی خواہشات کا گلا گھونٹ کر دوسری خوش نصیب عورتوں کو دیکھ دیکھ کر گھٹ گھٹ کے زندگی گزارے گی۔

مسئلے کی مزید وضاحت

ایک بات یہ بھی سمجھتے چلیں کہ اسلام نے ایک مرد کو ایک سے چار عدد تک بیویاں رکھنے کی صرف اجازت دی ہے، واجب اور ضروری نہیں قرار دیا ہے، یہ اجازت بھی مشروط ہے، وہ شرط یہ ہے کہ ایک سے زائد بیویاں اگر کسی کے نکاح میں ہیں تو ان کے درمیان پورا پورا عدل کرنا ضروری ہے، اگر کوئی عدل کرنے پر قادر نہیں ہے تو اسے ایک بیوی پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔

پہلے ذکر کیا گیا کہ یہ خدائی قانون ہے جو سماجی مسائل کا حل ہے، اگر عورتوں کی تعداد زیادہ ہو تو اس سے بہتر کوئی حل نہیں ہے کہ ایک مرد، ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرے۔

کچھ حالات ایسے بھی ہیں جو عمومی طور پر دنیا میں پیش آتے رہتے ہیں، جن کی بنا پر عورتوں کی تعداد بہ نسبت مردوں کے زیادہ ہوجاتی ہے: مثال کے طور پر جنگوں میں اکثر مرد ہی شریک ہوتے ہیں، ان جنگوں میں لڑائی کے دوران مردوں کی ہلاکت ہوتی رہتی ہے، ان حالات میں بھی مردوں کی تعداد کم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح کام کے دوران یا سرراہ جو ہلاکت خیز حادثات پیش آتے رہتے ہیں ان میں بھی مرد ہی زیادہ ہوتے ہیں، الغرض جس وجہ سے بھی مرد و عورت کی تعداد میں اس طرح کا فرق آئے گا اور توازن باقی نہیں رہے گا، وہاں اس اسلامی حل کے سوا دنیا کے پاس کوئی شریفانہ حل نہیں ہے۔

کچھ انفرادی حالات بھی ایسے رونما ہوتے ہیں جو بعض دفعہ دوسری شادی پر مجبور کرتے ہیں؛ مثال کے طور پر کسی عورت کا بیمار یا کمزور ہونا اور شوہر کا نہایت ''طاقت ور'' ہونا، جب کہ اس کی جنسی خواہشات کی تکمیل نہ ہو پارہی ہو اور نفس پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہو، ایسی صورت حال میں پاکیزہ حل تعدّد ہی ہے، جب کہ دوسرے معاشروں میں اس کا حل وہ ہے جس کی قباحت اور خباثت کو بیان کرنے سے زبان قاصر ہے، جسے کوئی شریف فرد یا صالح معاشرہ ہرگز قبول نہیں کرسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن جن مسائل کو ابھار کر اسلام پر اعتراضات کیے جاتے ہیں، اگر آپ نے غور سے پڑھا اور سمجھ لیا ہوگا تو یقیناً معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ دراصل وہ مسائل ہیں جن سے اسلام کی حقانیت ثابت ہوتی ہے، ان سے اسلامی تعلیمات کا حسن و جمال مزید آب

وتاب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور یہ بات پوری قوت کے ساتھ دوبارہ انسانی ذہن کو دعوتِ فکر دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسانیت کے لیے اس سے بہتر اور پاکیزہ نظام نہیں ہو سکتا، کیوں کہ یہ وہ خدائی نظام و دستور ہے جو اس نے خود اپنے بندوں کے لیے متعیّن کیا ہے اور بندوں کے احوال اس سے زیادہ کون جانتا ہے:

﴿قُلْ ءَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ ٱللَّهُ﴾ [البقرة: ١٤٠]

”آپ کہہ دیجیے! کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟“۔ [سورۂ بقرة:۱۴۰]

﴿وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾﴾ [البقرة: ٢١٦]

”اور اللہ ہی (اصل حقیقت) جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے“۔

[سورۂ بقرة:۲۱۶]

* * *

۳/رجب/۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برکت اور بے برکتی

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس بابرکت ہے، بلکہ برکتوں کا مرکز ومصدر دراصل اللہ ہی ہے، قرآنِ کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿تَبَارَكَ ٱلَّذِى نَزَّلَ ٱلْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِۦ لِيَكُونَ لِلْعَٰلَمِينَ نَذِيرًا ۝١﴾ [الفرقان: ١]

”بہت بابرکت ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر حق وباطل کا فیصلہ کردینے والی یہ کتاب نازل کی، تاکہ وہ دنیا جہان کے لوگوں کو خبردار کردے“۔

[سورۂ فرقان:۱]

﴿تَبَٰرَكَ ٱلَّذِى بِيَدِهِ ٱلْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ۝١﴾

[الملك: ١]

”بہت بابرکت ہے وہ ذات، جس کے ہاتھ میں ساری بادشاہی ہے، اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے“۔[سورۂ ملک:۱]

﴿تَبَٰرَكَ ٱسْمُ رَبِّكَ ذِى ٱلْجَلَٰلِ وَٱلْإِكْرَامِ ۝٧٨﴾ [الرحمن: ٧٨]

”بڑا بابرکت نام ہے تمہارے پروردگار کا جو عظمت والا بھی ہے اور کرم والا بھی“۔[سورۂ رحمن:۷۸]

رسول اکرم صَلَّىٰ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کی اس عظمت وبرکت کا اعتراف فرمایا کرتے تھے، ایک دعا کے آغاز میں اللہ کی ثناء بیان کرتے ہوئے فرمایا:

«تبَارَكْتَ وَتعَالَيْتَ يَا ذَا الْجَلالِ وَالإِكْرَامِ»، نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے بعد جو ثناء پڑھی جاتی ہے اس میں بھی «وَتبَارَكَ اسْمُكَ، وَتعَالَى جَدُّكَ» کے الفاظ موجود ہیں۔

برکت کیا ہے؟

برکت حقیقت میں خیر کثیر، بڑھوتری اور نشوونما کو کہتے ہیں، اسی طرح اضافہ، کسی چیز میں زیادتی اور خوش حالی کو بھی برکت سے تعبیر کرتے ہیں، نیز تھوڑی چیز زیادہ افراد کے لیے نفع بخش ثابت ہو، اسے بھی برکت کہتے ہیں، پائیدار اور دیرپا ہو، مستحکم اور مضبوط ہو، اسے بھی برکت کہتے ہیں۔

بابرکت ہستیاں

قرآنِ کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ برکت کی متعدّد قسمیں ہیں، چناں چہ برکت، شخصیات میں ہوتی ہے، مقامات میں ہوتی ہے اور اوقات میں ہوتی ہے، بابرکت ہستیوں میں حضرت نوح علیہ السلام بھی ہیں؛ بلکہ ان پر ایمان لانے والے ان کے اصحاب بھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قِيلَ يَٰنُوحُ ٱهۡبِطۡ بِسَلَٰمٖ مِّنَّا وَبَرَكَٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلَىٰٓ أُمَمٖ مِّمَّن مَّعَكَۚ﴾ [هود: ٤٨]

”فرمایا گیا کہ: اے نوح! اب (کشتی سے) اتر جاؤ، ہماری طرف سے وہ سلامتی اور برکتیں لے کر جو تمہارے لیے بھی ہیں اور تمہارے ساتھ جتنی قومیں ہیں، ان کے لیے بھی“۔[سورۂ ہود:۴۸]

حضرت ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَبَٰرَكۡنَا عَلَيۡهِ وَعَلَىٰٓ إِسۡحَٰقَۚ﴾ [الصافات: ١١٣]

”اور ہم نے ابراہیم اور اسحاق (علیہما السلام) پر برکتیں نازل فرمائیں“۔ [سورۂ صافات:۱۱۳]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَآءَهَا نُودِيَ أَنۢ بُورِكَ مَن فِي ٱلنَّارِ وَمَنۡ حَوۡلَهَا﴾ [النمل: ٨]

”چناں چہ جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو انہیں آواز دی گئی کہ برکت ہو ان پر بھی جو اس آگے کے اندر ہیں اور ان پر بھی جو اس کے آس پاس ہیں“۔ [سورۂ نمل:۸]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابرکت شخصیت کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيۡنَ مَا كُنتُ﴾ [مريم: ٣١]

”اور جہاں بھی میں رہوں، مجھے اس نے بابرکت بنایا ہے“۔[سورۂ مریم:۳۱]

سرورِ عالم حضرت اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کا کیا پوچھنا، آپؐ کی ذات بابرکت، آپؐ کی بعثت ورسالت بابرکت اور آپؐ کی ہر نقل وحرکت بابرکت۔ آپؐ کی

بعثت، ایسی وسیع نعمت و رحمت اور برکت تھی جس نے سارے عالم کو پیغامِ رحمت و برکت دیا، ہر شخص اس رحمت و برکت کے سایے میں آکر پناہ لے سکتا ہے۔

صحیح البخاری میں حضرت ابو طلحہؓ کا قصہ مذکور ہے، کہ ان کی رہائش گاہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، ان کے گھر میں نہایت معمولی مقدار میں روٹی تھی، حضورؐ نے اسے منگایا اور کچھ پڑھ کر فرمایا کہ لوگوں کو کھانے کے لیے بلاؤ، چناں چہ دس دس افراد داخل ہوتے اور پوری طرح سیر ہو کر نکلتے، یہاں تک کہ تقریبًا اسی افراد نے خوب سیر ہو کر کھایا، یہ حضورؐ کی بابرکت ذات والاصفات کا نتیجہ تھا۔

ایک موقع پر حضورؐ نے پانی کے ایک مشکیزے میں اپنی انگلی مبارک ڈالی، اس سے اتنا پانی نکلا کہ تقریبا پندرہ سو صحابۂ کرام نے پیا اور وضو کیا۔ [بخاری شریف]

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ دعا بھی فرمائی ہے:

«وَبَارِكْ لِيْ فِيمَا أَعْطَيْتَ» ”اور اے اللہ! تو نے جو کچھ مجھے عطا فرمایا ہے اس میں برکت دے“۔ [ابوداؤد شریف]

بابرکت مقامات

اللہ تعالیٰ نے بعض مقامات کو بابرکت بتایا ہے، چناں چہ مکہ مکرمہ وہ مبارک شہر ہے جہاں نیکیوں میں بھی خوب برکت ہوتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ اور اہل مکہ کے لیے دعا فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کے بارے میں فرمایا:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩٦﴾﴾ [آل عمران: ٩٦]

”حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا، یقینی طور پر وہ ہے جو مکہ میں واقع ہے (اور) بنانے کے وقت ہی سے برکتوں والا اور دنیا جہان کے لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے“۔[سورۂ آلِ عمران:۹۶]

مدینہ منورہ بابرکت شہر ہے، اس کی برکت کے لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی:

«اللهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا». [رواه مسلم]

”اے اللہ! ہمارے مدینہ میں برکت نازل فرما“۔[مسلم شریف]

دوسری روایت میں ہے:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي مِكْيَالِهِمْ، وَبَارِكْ لَهُمْ فِي صَاعِهِمْ، وَمُدِّهِمْ يَعْنِي أَهْلَ المَدِينَةِ». [صحيح البخاري]

”اے اللہ! مدینہ والوں کے پیمانوں میں برکت دے، اور انہیں ان کے صاع اور مُدّ میں برکت دے“۔ (راوی کہتے ہیں کہ) آپؐ کی مراد اہل مدینہ ہیں۔ [بخاری شریف]

مسجد اقصیٰ اور اس کے اطراف کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿سُبْحَـٰنَ ٱلَّذِىٓ أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِۦ لَيْلًا مِّنَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ إِلَى ٱلْمَسْجِدِ ٱلْأَقْصَا ٱلَّذِى بَـٰرَكْنَا حَوْلَهُۥ لِنُرِيَهُۥ مِنْ ءَايَـٰتِنَآ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ۝١﴾ [الإسراء: ١]

”پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، جس کے آس پاس ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انہیں

اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے"۔[سورۂ بنی اسرائیل:۱]

وادیٔ "عقیق" بھی مبارک وادی ہے، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رات میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا فرشتہ آیا (آپ اس وقت وادیٔ عقیق میں قیام پذیر تھے) اور اس نے یہ پیغام دیا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھیے، اور کہا کہ آپ کہیے: عمرہ، حج میں شامل ہوگیا"۔ [بخاری شریف]

متعدّد آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو "مبارک" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے:

﴿ وَهَٰذَا كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ مُبَارَكٌ ﴾ [الأنعام: ١٥٥]

"اور یہ برکت والی کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے"۔[سورۂ انعام:۱۵۵]

﴿ وَهَٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَٰهُ ﴾ [الأنبياء: ٥٠]

"اور یہ برکتوں والا پیغام ونصیحت ہے جو ہم نے نازل کیا ہے"۔[سورۂ انبیاء:۵۰]

﴿ كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ مُبَٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوٓا۟ ءَايَٰتِهِۦ وَلِيَتَذَكَّرَ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ ﴿٢٩﴾ ﴾ [ص: ٢٩]

"یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تم پر اس لیے اتاری ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور وفکر کریں، اور تاکہ عقل رکھنے والے نصیحت حاصل کریں"۔[سورۂ ص:۲۹]

مبارک اوقات

بعض اوقات بھی مبارک ہوتے ہیں، چناں چہ جس رات میں قرآنِ کریم نازل کیا گیا وہ رات مبارک رات ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَـٰهُ فِى لَيْلَةٍ مُّبَـٰرَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ﴿٣﴾﴾

[الدخان: ۳]

”ہم نے اسے ایک مبارک رات میں اتارا ہے، ہم لوگوں کو خبر دار کرنے والے تھے“۔ [سورۂ دخان:۳]

وہ مبارک رات، لیلۃ القدر ہے جس کی برکتیں بے پناہ ہیں، صرف ایک رات، ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

برکت کے آثار

مذکورہ چیزوں کی برکت نصوص سے ثابت ہے، لہٰذا ان برکات سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ برکت کے معنی صرف اضافے اور بڑھوتری کے نہیں ہیں، بلکہ تھوڑی چیز بہتوں کے لیے کافی ہوجائے یہ بھی برکت ہے، اسی طرح تھوڑے وقت میں زیادہ کام ہوجائے، یہ بھی برکت ہے؛ چناں چہ بعض اہل علم اور اہل صلاح کے کارناموں میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر برکت دی کہ تھوڑی عمر میں انہوں نے اتنے علمی کارنامے انجام دیے جنہیں دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے، بعض صلحاء مختصر وقت میں پورا قرآن شروع سے آخر تک پڑھ جاتے تھے، بعض اہل اللہ رات دن میں سینکڑوں رکعات نوافل کی ادا

کرتے تھے، اسی طرح اپنے تھوڑے مال سے سینکڑوں طلبہ کی کفالت کرلیتے تھے، برکت کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو مبارک اولاد نصیب ہو اور عدد میں کم ہونے کے باوجود کتاب اللہ کے حافظ ہوں، دین کے عالم ہوں اور دعوت الی اللہ کے متوالے ہوں، پھر ان کے ہاتھ پہ خلقِ کثیر کو اللہ ہدایت دے۔ یہ سب برکت کے آثار و مظاہر ہیں، بندہ جس قدر تقویٰ شعار اور پاک باز ہوگا، اسی قدر اس کی زندگی میں اور اس کے علم وعمل میں اور دیگر خدائی عطایا میں برکت ہوگی، لیکن اگر کوئی شخص برکات سے محروم ہے، نہ وقت میں برکت، نہ علم وعمل میں برکت، نہ دیگر اشیاء میں برکت ہے، تو پھر اسے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور سبب کی تلاش میں لگنا چاہیے، خدانخواستہ کسی گناہ یا غلطی کا ارتکاب تو نہیں ہوگیا جس کی وجہ سے برکات سے محرومی ہوگئی۔

حصولِ برکت کے اسباب

اہل خانہ کو سلام

جن چیزوں سے برکتوں کا نزول ہوتا ہے، انہیں شریعت نے بیان کر دیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب ہم اپنے گھر میں داخل ہوں تو اہل خانہ کو سلام کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ مُبَٰرَكَةً طَيِّبَةً ۚ﴾ [النور: ٦١]

”چناں چہ جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، کہ یہ

ملاقات کی وہ بابرکت پاکیزہ دعا ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہے“۔ [سورۂ نور:۶۱]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَا بُنَيَّ! إِذَا دَخَلْتَ عَلَى أَهْلِكَ فَسَلِّمْ، يَكُنْ بَرَكَةً عَلَيْكَ وَعَلَى أَهْلِ بَيْتِكَ». [رواه الترمذي]

”بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ (یعنی گھر میں داخل ہو) تو سلام کرو، یہ تمہارے لیے اور تمہارے گھر والوں کے لیے باعث برکت ہوگا“۔ [ترمذی شریف]

امام بخاریؒ نے ”الأدب المفرد“ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جس گھر میں تم داخل ہوے اس میں کوئی نہ ہو تو یوں کہو:

«السَّلاَمُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ».

کھانے میں برکت کے اسباب

اجتماعی طور پر کھانا کھانے میں برکت ہوتی ہے، اسی طرح کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا، کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا اور بعد کی دعا پڑھنا، اگر انواع واقسام کے کھانے ہوں یا برتن بڑا ہو اور اجتماعی کھانا ہو تو اپنے قریب سے کھانا باعث خیر وبرکت ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلَا يَأْكُلْ مِنْ أَعْلَى الصَّحْفَةِ، وَلَكِنْ لِيَأْكُلْ مِنْ أَسْفَلِهَا، فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ مِنْ أَعْلَاهَا». [أبوداؤد]

”جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو برتن کے اوپر (یعنی درمیان) سے نہ

کھائے، بلکہ نیچے (یعنی اپنے قریب) سے کھائے، کیوں کہ برکت اوپر سے اترتی ہے“۔[ابوداؤد شریف]

یعنی چوں کہ برکت وسط طعام میں اترتی ہے، وہاں سے ہر جانب کو جاتی ہے، اس لیے اگر درمیان سے ہی شروع کیا تو برکت ختم ہو جائے گی اور ہر جانب پہنچ نہیں سکے گی۔

کھانے کے بعد دعا کرنا باعث برکت ہے، خاص طور سے اگر کوئی تقویٰ شعار مومن آپ کے گھر میں کھانا کھائے اور دعائے خیر و برکت سے آپ کو نوازے۔

ایک صحابی نے حضور صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی ضیافت کی، آپؐ نے کھانے سے فارغ ہو کر ان کے لیے یہ دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيمَا رَزَقْتَهُمْ، وَاغْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ». [مسلم]

”اے اللہ! ان کی روزی میں برکت عطا فرما، ان کی بخشش فرما اور ان پہ رحم فرما“۔[مسلم شریف]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے برتن اور انگلیوں کو چاٹنے اور صاف کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا:

«فَإِنَّكُمْ لَا تَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ». [رواه مسلم]

”کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے“۔

[مسلم شریف]

سَحُور میں بھی برکت ہے، لہٰذا روزے دار کو سحری ضرور کرنی چاہیے، تاکہ یہ برکت حاصل ہو سکے، حضورؐ نے فرمایا:

«تَسَحَّرُوا فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً». [متفق عليه]

”سحری کھایا کرو، کیوں کہ سحری میں برکت ہے“۔[متفق علیہ]

زمزم کا پانی بھی مبارک پانی ہے، اس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا:

«إِنَّهَا مُبَارَكَةٌ، إِنَّهَا طَعَامُ طُعْمٍ». [مسلم]

یہ بابرکت ہے، یہ کھانے کا کھانا بھی ہے“۔[مسلم شریف]

یعنی یہ ایسا بابرکت پانی ہے کہ کئی روز تک صرف اسی پانی پر گزبسر ہوسکتا ہے، بغیر کسی دوسری غذا کے۔

صبح کی برکت

صبح سویرے کسی کام کے لیے نکلنا، یا کاروبار میں مشغول ہونا، یا صبح کے وقت سفر کرنا باعث برکت ہے، جو شخص صبح کے وقت سونے کے بہ جائے اپنے کام میں لگ جاتا ہے، وہ برکت کی اس دعا کا بھی مستحق ہوتا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے فرمائی ہے:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لِأُمَّتِي فِي بُكُورِهَا». [الترمذي وأبوداؤد]

”اے اللہ! میری امت کے دن کے ابتدائی حصے میں برکت دے“۔

[ترمذی وابوداؤد]

تقویٰ اور اہل تقویٰ کی برکات

ایمان اور تقویٰ یہ دو صفات کسی کے اندر جمع ہوجائیں تو وہ برکت کا مستحق ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ ٱلْقُرَىٰٓ ءَامَنُوا۟ وَٱتَّقَوْا۟ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَٰتٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا۟ فَأَخَذْنَٰهُم بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾﴾ [الأعراف: ٩٦]

"اور اگر یہ بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین دونوں طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے؛ لیکن انہوں نے (حق کو) جھٹلایا، اس لیے ان کی مسلسل بدعملی کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا"۔ [سورۂ اعراف:۹۶]

سید المتقین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سراپا برکت تھی اسی لیے تو صحابۂ کرامؓ اپنے بچوں کو آپ کی خدمت میں لے کر آتے تھے؛ تاکہ آپ کی برکات سے مستفید ہوں۔ حضرت سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ میری خالہ مجھے لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپؐ نے میرے سر پہ دستِ شفقت پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا فرمائی:

«فَمَسَحَ رَأْسِي وَدَعَا لِي بِالْبَرَكَةِ». [صحيح البخاري]

"تو آپؐ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا فرمائی"۔

[بخاری شریف]

حضرت انسؓ کی والدہ محترمہ ان کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ آپ کا خادم انس ہے، آپ اس کے لیے دعا فرمادیجیے۔ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعا دیتے ہوئے یہ کلمات کہے:

«اللَّهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهُ، وَوَلَدَهُ، وَبَارِكْ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتَهُ».

[صحيح البخاري]

”اے اللہ! اس کو کثرت سے مال واولاد عطا فرما اور جو کچھ اسے تونے دیا ہے
اس میں برکت دے“۔ [بخاری شریف]

اس دعا کی قبولیت کا اثر یہ تھا کہ حضرت انسؓ خود ہی فرماتے ہیں کہ میں انصار میں مال دار ترین ہو گیا اور میری اولاد اتنی ہوئی کہ میری زندگی میں ہی میری صلبی اولاد میں سے ایک سو بیس سے زیادہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ [بخاری شریف]

صلۂ رحمی کی برکت

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کی خدمت اور ان کی خوشنودی اور رشتے داروں کے ساتھ صلۂ رحمی بھی باعثِ خیر وبرکت ہے، اس کی وجہ سے عمر میں، مال میں اور عیال میں برکت ہوتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، أَوْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ». [متفق عليه]

”جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی روزی میں کشادگی ہو اور اس کی عمر دراز ہو تو
اسے صلہ رحمی کرنی چاہیے“۔ [متفق علیہ]

خرید وفروخت میں صداقت وامانت

لین دین اور خرید وفروخت میں سچائی، امانت داری اور اگر سامانِ تجارت میں کوئی عیب ہو تو اس کی وضاحت باعثِ برکت ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو یعنی غلط بیانی سے کام لیا جائے یا عیوب کو چھپا لیا جائے تو معاملے کی برکت ختم ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا ارشاد ہے:

«البَيِّعَانِ بِالخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا، - أَوْ قَالَ: حَتَّى يَتَفَرَّقَا - فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا». [صحيح البخاري]

"خرید و فروخت کرنے والوں کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں، پس اگر انہوں نے سچائی سے کام لیا اور ہر بات صاف صاف بیان کردی تو ان کے معاملے میں برکت ہوگی، لیکن اگر کوئی بات چھپالی یا جھوٹ سے کام لیا تو ان کی برکت ختم ہوجاتی ہے"۔ [بخاری شریف]

بابرکت نکاح

مہر کی بڑی رقم طے کرنا اور شادی کے موقع پر بے تحاشا خرچ کرنا شریعت کی نگاہ میں کوئی قابل ستائش امر نہیں ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے شادی مشکل ترین ہوجائے گی، جس کے نتیجے میں بے راہ روی اور اخلاقی تنزلی وجود میں آئے گی؛ لیکن اگر کم خرچ میں شادی کا رواج عام ہوجائے تو نہ صرف یہ کہ حلال آسان ہوگا، بلکہ اس طرح کی شادی باعث خیر وبرکت بھی ہوگی۔ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

«أَعْظَمُ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ مُؤْنَةً». [رواه أحمد والنسائي]

"سب سے زیادہ بابرکت عورتیں وہ ہوتی ہیں جن کا خرچہ کم ہو"۔

[احمد و نسائی]

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«أَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهَا مَئُونَةً». [أحمد والنسائي]

”سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہوتا ہے جس میں خرچ کم ہوتا ہے“۔

[احمد ونسائی]

بے برکتی کے اسباب

مذکورہ بالا اسبابِ برکت کی خلاف ورزی سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے، نیز خرید وفروخت اور لین دین میں کثرت سے قسمیں کھانے سے بھی برکت سلب ہوجاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

«الْحَلِفُ مَنْفَقَةٌ لِلسِّلْعَةِ، مَمْحَقَةٌ لِلرِّبْحِ». [مسلم]

ایک روایت میں ہے:

«الحَلِفُ مُنَفِّقَةٌ لِلسِّلْعَةِ، مُمْحِقَةٌ لِلْبَرَكَةِ». [صحيح البخاري]

”قسم، سامان کو فروغ دینے والی ہے، (لیکن) برکت اور نفع کو مٹانے والی ہے“۔[بخاری ومسلم]

اسی طرح حرص وطمع، تجارت میں دھوکہ وبددیانتی، جھوٹ فریب، ناجائز اور حرام طریقے سے مال کا حصول اور ناجائز وحرام مصارف اور معاصی میں اس کو خرچ کرنا وغیرہ یہ وہ امور ہیں جن سے برکت چھن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں برکتوں سے مالامال فرمائیں اور بے برکتی سے محفوظ رکھیں۔

***

۱۴۲۷/۲/۱۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں داڑھی کی اہمیت

اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر اور قابل قبول دین و مذہب صرف اسلام ہے، اسلام دین فطرت بھی ہے اور کامل و مکمل بھی، ہر مسلمان سے یہ مطالبہ ہے کہ اس مکمل دین کو مضبوطی کے ساتھ تھامے، اسی ایمان پر عزت و رفعت کا وعدہ ہے جو انسان کی زندگی کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر حاوی ہو۔

﴿وَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝٨﴾ [المنافقون: ۸]

”اور عزت تو اللہ ہی کو حاصل ہے، اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو، لیکن منافق لوگ نہیں جانتے“۔[سورۂ منافقون:۸]

ہم ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ”صراطِ مستقیم“ پر چلائے، جس صراطِ مستقیم پر اس کے برگزیدہ بندے چلتے رہے، یعنی انبیائے کرام علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین حضرات۔

حضورؐ عام طور پر جمعے کے خطبے میں یہ فرماتے تھے:

«إِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ، وَأَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ» (ﷺ) [رواه النسائي]

"بے شک سب سے سچی بات، اللہ کی کتاب ہے، اور بہترین طریقہ محمد (ﷺ) کا طریقہ ہے"۔[نسائی شریف]

اس میں ذرہ بھی شک نہیں کہ سب سے بہتر طریقۂ کار، رسول اللہ ﷺ کا ہے، آپؐ نے جس سنت و شریعت کو اپنایا اور جس کی تعلیم دی اس سے بہتر اسوہ اور نمونہ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے آپؐ کو نمونہ بنا کر بھیجا۔ آپؐ کی لائی ہوئی شریعت کو سب کے لیے راہ بر اور راہ نما بنا کر اس پر عمل کا مطالبہ کیا۔

رسول اکرم ﷺ کی پیروی زندگی کے تمام گوشوں میں

ہر مسلمان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے، عبادات میں بھی، معاملات میں بھی، اخلاقیات اور معاشرت میں بھی؛ لہٰذا نماز اس طرح پڑھے جس طرح رسول اکرم ﷺ نے پڑھی، روزے اس طرح رکھے جس طرح حضورؐ نے رکھے، حج و زکات کی ادائیگی میں پوری طرح آپؐ کے ارشادات کو مد نظر رکھے۔

معاملات میں سچائی اور امانت داری ہمہ وقت ملحوظ رہے، سامانِ تجارت میں اگر کوئی عیب ہو تو اسے چھپائے نہیں، دھوکہ اور خیانت سے اس طرح اپنے آپ کو بچائے رکھے جس طرح نجاست و غلاظت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

ظاہر و باطن میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی کوشش کرے، کہ اسی میں نجات ہے اور اسی میں اللہ کی رضا بھی پوشیدہ ہے۔

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣١﴾ ﴾ [آل عمران: ٣١]

"آپ کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کردے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے"۔ [سورۂ آل عمران: ۳۱]

داڑھی رکھنے کی تاکید

چہرے پر داڑھی سجانا اور مونچھیں کتروانا ایسا عمل ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنایا اور امت کو اس کا حکم بھی دیا۔ آپ کی داڑھی مبارک کے سلسلے میں حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں:

«كَانَ كَثِيرَ شَعْرِ اللِّحْيَةِ» [صحيح مسلم]

"آپ کی داڑھی کے بال بہت تھے، یعنی گھنی داڑھی تھی"۔ [مسلم شریف]

بلکہ یہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی سنت ہے، چناں چہ قرآن کریم میں حضرت ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کا ذکر ہے، جس میں حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

﴿يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِى وَلَا بِرَأْسِىٓ ﴾ [طه: ٩٤]

"اے میری ماں کے بیٹے! میری داڑھی نہ پکڑو اور نہ میرا سر"۔ [سورۂ طٰہٰ: ۹۴]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں چھوٹی کرنے کا حکم فرمایا ہے، ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

«جُزُّوا الشَّوَارِبَ، وَأَرْخُوا اللِّحَى، خَالِفُوا الْمَجُوسَ».

[صحيح مسلم]

”مونچھیں کترواؤاور داڑھیاں بڑھاؤ، آتش پرستوں کی مخالفت کرو“۔

[مسلم شریف]

دوسری روایت میں ہے:

«قُصُّوا الشَّوَارِبَ، وَأَعْفُوا اللِّحَى». [صحيح البخاري]

”مونچھیں اچھی طرح کتروالو اور داڑھیاں بڑھاؤ“۔[بخاری شریف]

اس طرح کا حکم مختلف الفاظ کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں وارد ہوا ہے جس سے اس کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔ چوں کہ ہمیں آپؐ کی اطاعت کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، لہٰذا اس حکم کی پابندی بھی ہر مسلمان مرد کے لیے ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ ۖ﴾ [النور: ٥٤]

”آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کا حکم مانو اور رسول کی اطاعت کرو“۔[سورۂ نور:۵۴]

ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ ۖ﴾ [النساء: ٨٠]

”جو رسول کی اطاعت کرے، اس نے اللہ کی اطاعت کی“۔[سورۂ نساء:۸۰]

لہٰذا ہر مسلمان کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت کرنا ضروری بھی ہے اور باعث سعادت بھی، جب یہ ثابت ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وشریعت سے بہتر کوئی سنت وشریعت نہیں، آپؐ نے داڑھی رکھ کر، مونچھیں کترواکر عملی طور پر بھی اور قولی طور پر بھی امت کو داڑھی رکھنے اور مونچھیں چھوٹی کرنے کی تاکید فرمائی، اور

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اطاعت کا حکم ہمیں دیا، بلکہ حضور ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا، تو اب آپ کی نافرمانی کرنا، یا اس حکم کی بے جا و تاویل کرنا محرومی کے سوا کچھ نہیں، بلکہ حضور ﷺ کے امر کی مخالفت کی وجہ سے عتابِ الٰہی اور غضبِ الٰہی سے بھی ڈرنا چاہیے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِۦٓ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾﴾ [النور: ٦٣]

”لہٰذا جو لوگ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی آفت نہ آپڑے، یا انہیں کوئی دردناک عذاب نہ آپکڑے“۔ [سورۂ نور: ۶۳]

داڑھی رکھنا تمام انبیائے کرامؑ اور تمام صحابۂ کرامؓ کا معمول

داڑھی رکھنا تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت ہے، اسی طرح تمام صحابۂ کرامؓ کی بھی سنت ہے، میری اپنی معلومات کے مطابق کسی نبی نے یا کسی صحابی نے داڑھی نہیں منڈائی، البتہ بعض صحابۂ کرام سے یہ ثابت ہے کہ ایک قبضہ (مشت) سے زیادہ بال پکڑ کر کاٹ لیتے تھے، جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں ہے:

«وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ، قَبَضَ عَلَى لِحْيَتِهِ، فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ». [صحيح البخاري]

”ابن عمرؓ جب حج یا عمرہ کرتے تھے تو (فارغ ہونے کے بعد) اپنی داڑھی کو اپنے ہاتھ سے پکڑتے اور جو (مشت سے) زیادہ بال ہوتے انہیں

کاٹ لیتے تھے"۔ [بخاری شریف]

بلکہ امام ترمذی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک بھی ذکر کیا ہے کہ آپؐ اپنی داڑھی کو طول وعرض سے کترواتے تھے، لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔

ایک مشت سے زیادہ لمبی داڑھی کا کتروانا تو بعض صحابۂ کرام سے ثابت ہے، لیکن داڑھی منڈانا کسی صحابی سے ثابت نہیں، لہٰذا اپنے پیارے نبی ﷺ اور دیگر تمام انبیائے کرامؑ اور تمام صحابۂ کرامؓ کی مبارک سنت کو چھوڑ کر کفار ومشرکین اور آتش پرستوں کی مشابہت اختیار کرنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

داڑھی رکھنا عادت ہے یا عبادت؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ داڑھی رکھنا عادات کے قبیل سے ہے، نہ کہ عبادات کے قبیل سے، یعنی حضور ﷺ کے زمانے میں آپؐ کے معاشرے میں داڑھی رکھنے کی عام عادت تھی، اسی لیے آپؐ نے بھی داڑھی رکھی اور صحابۂ کرام نے بھی، لہٰذا اگر موجودہ دور میں کسی معاشرے میں داڑھی منڈانے کی عادت ہو تو منڈانے میں کوئی حرج نہیں ہے — یہ بات قطعاً غلط ہے — یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کی گہری نظر نہ شریعت پہ ہو نہ اصولِ شریعت پہ، جس مسئلے کو حضورؐ نے تاکیدی طور پر مختلف الفاظ کے ذریعہ بیان فرمایا ہو، اور تمام صحابۂ کرام نے اس پر عمل بھی کیا ہو، کسی نے اس کی مخالفت نہ کی ہو، اس کا مطلب ہے کہ وہ شرعی حکم ہے جسے صحابۂ کرامؓ نے اسی طرح سمجھا ہے اور اس پر عمل کیا ہے، اگر یہ امر ضروری نہیں ہوتا تو کسی ایک صحابی نے بھی اس کو غیر ضروری سمجھا ہوتا اور داڑھی منڈائی ہوتی، لیکن ایک صحابی نے بھی اسے غیر ضروری نہیں سمجھا، بلا استثناء تمام صحابۂ کرام نے اور سلف

صالحین نے داڑھی رکھی اور منڈانے کو گناہ سمجھا، اس لیے یہ عادت نہیں، بلکہ عبادت ہے، اسے شرعی مسئلہ سمجھ کر اس پر عمل کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے، بالخصوص ایسے وقت میں جب اجتماعی طور پر اس کی مخالفت کی جارہی ہو، داڑھی منڈانے کو "جدید فیشن" سمجھا جاتا ہو، داڑھی رکھنے والوں کو دقیانوس اور قدامت پسند اور رجعت پسند کہا جاتا ہو، ایسے حالات میں داڑھی رکھنا اور نبی اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی اتباع کرنا یقیناً مزید اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ رسول اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ عِظَمَ الجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ البَلاَءِ». [الترمذي]

"یعنی آزمائش اور مشقت و مجاہدہ زیادہ ہو تو اجر بھی زیادہ ملتا ہے"۔

[ترمذی شریف]

ذرائعِ ابلاغ کا منفی اثر

دنیا میں بے حساب آمدنی اور مادی ترقی کے تین بنیادی وسائل ہیں:

(۱) ایک سودی کاروبار۔

(۲) دوسرے منشیات کی تجارت۔

(۳) تیسرے شہوت پرستی کے اڈے۔

اسلام ان تینوں وسائل کے خلاف کھڑا ہے، ان تینوں وسائل کو حرام قرار دیتا ہے، گویا کہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور بڑے بڑے تاجروں کے مقابلے میں اسلام کھڑا ہے، اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اسلام اور اہل اسلام کی مخالفت میں اپنے تن، من دھن کی بازی نہ لگائیں، انہوں نے اسلام کو بدنام کرنے کے لیے بے شمار حربے استعمال کیے ہیں؛ انہی میں

میں سے ایک یہ ہے کہ اسلامی شعائر پر پابندی سے عمل کرنے والوں کی شبیہ بگاڑنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھ کنڈے استعمال کیے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ شرعی وضع قطع رکھنے والوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے، اس کے لیے وہ اس حد تک جاگرے کہ بعض ملکوں میں اپنے ایجنٹ بھیجے، انہوں نے لمبی لمبی داڑھیاں رکھ لیں، پھر انہوں نے دہشت گردانہ حملے کیے، یہاں تک کہ بعض اسکولوں پہ حملہ کرکے سیکڑوں معصوم بچوں کی جانیں لے لیں، لیکن اتفاق سے کچھ جاں بازوں کے ردّعمل سے دفاعی کارروائی ہوئی، جب ان کی لاشوں کی تحقیق ہوئی اور ان کے جسموں پر بنے ہوئے نقوش دیکھے گئے تو پتہ چلا کہ یہ غیر مسلم تربیت یافتہ نوجوان تھے جنہیں دہشت گردانہ کارروائی کے لیے تیار کرکے دوسرے ملک میں بھیجا گیا تھا، تاکہ ایک طرف مسلم معصوم بچے مریں، دوسری طرف ”قدامت پسند“ مسلمان بدنام ہوں، تاکہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کی نفرت پیدا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی سازشوں کو بے نقاب کیا اور ان کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی، تاہم ان کی انتھک کوشش جاری ہے کہ باشرع مسلمانوں کو بدنام کیا جائے جس کے لیے وہ تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کررہے ہیں — بدقسمتی سے ہمارے اپنے لوگ بھی اس سے متأثر ہوجاتے ہیں اور ”دہشت گردی“ کے اس عار سے بچنے کے لیے اسلامی وضع قطع کو اختیار نہیں کرپاتے؛ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جس طرح باطل نے اپنی سازشوں کا جال بچھا رکھا ہے، اسی طرح ہم اسلام سے اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر ان کی سازشوں کو ناکام بناتے، اس کا بہترین مقابلہ یہ ہے کہ ہم اپنے شعائر پر پورے فخر کے ساتھ عمل کرکے، حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کے ذریعے دنیا کے سامنے یہ ثابت کریں کہ نہ تو ہم دہشت گرد ہیں، نہ ہی ہم تمہارے پروپگنڈے کی وجہ سے اپنے رب کے احکام سے

روگردانی کر سکتے ہیں، اگر ہم ایسا کریں گے تو ان شاء اللہ وہ وقت بھی آئے گا جب ان کے ناپاک ارادے خاکستر ہوں گے اور حق کا غلبہ ہوگا:

﴿فَأَمَّا ٱلزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءٗۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ﴾ [الرعد: ١٧]

”جو جھاگ ہوتا ہے وہ تو باہر گر کر ضائع ہو جاتا ہے، لیکن وہ چیز جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے“۔ [سورۂ رعد:۱۷]

داڑھی منڈانا حرام ہے

نصوص کی روشنی میں اہل علم فرماتے ہیں کہ داڑھی منڈانا حرام ہے، کیوں کہ یہ خلافِ فطرت عمل ہے، جس فطرت پر اللہ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے، اس حلق کی وجہ سے اللہ کے برگزیدہ انبیائے کرام علیہم السلام کی مخالفت لازم آتی ہے، اس میں مشرکین ومجوس کی مشابہت، نیز اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں اس کی اجازت کے بغیر تصرّف کا ارتکاب ہے، اس میں شیطان کی پیروی بھی ہے جس نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں بندوں کو ”خلق اللہ“ کی تغییر پر ضرور آمادہ کروں گا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَلَأٓمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ ٱللَّهِۚ وَمَن يَتَّخِذِ ٱلشَّيۡطَٰنَ وَلِيّٗا مِّن دُونِ ٱللَّهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانٗا مُّبِينٗا ١١٩﴾

[النساء: ١١٩]

”(شیطان نے قسم کھا کر کہا) ’اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کریں گے‘، اور جو شخص اللہ کے بجائے شیطان کو دوست بنائے اس نے

کھلے کھلے خسارے کا سودا کیا‘‘۔[سورۂ نساء:۱۱۹]

خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت اور دائمی راحت ولذت

ایمان کا کمال درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو شریعت کے تابع بنادے، حکمِ شریعت ہمیشہ پیش نظر رہے اور ہر چیز پر مقدم ہو، خواہ نفس کو گراں گزرے، کیوں کہ خواہشات نفس کی اتباع جہنم میں لے جائے گی اور اس کی مخالفت جنت میں لے جائے گی۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ، وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ».

[صحيح مسلم]

جنت، ناپسندیدہ چیزوں (دشواریوں اور مشقتوں) سے ڈھک دی گئی ہے
اور دوزخ، شہوتوں سے ڈھکی ہوئی ہے‘‘۔[مسلم شریف]

داڑھی رکھنے میں اگر صرف رضائے الٰہی پیشِ نظر ہو تو یہ کام مشکل نہیں، کیوں کہ اللہ کی رضا کے لیے ہر قربانی دی جاسکتی ہے، نفسانی خواہشات اور جذبات کی قربانی کیا چیز ہے؟ عام طور پر یہ سرکش نفس ہی انسان کو اس سنت پر عمل کرنے سے روکتا ہے، وہ یہ باور کراتا ہے کہ داڑھی کے بغیر چہرہ خوب صورت لگتا ہے، یا عمر کم لگتی ہے یا چہرے کی رعنائی اور دل کشی باقی رہتی ہے یا اس طرح انسان روشن خیال اور جدت پسند معلوم ہوتا ہے وغیرہ، لیکن یہ سب نفس کا دھوکہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری روشن خیالی، ترقی پسندی اور ہمارا ظاہری اور باطنی حسن وجمال صرف اللہ اور اس کے سچے رسولؐ کی اتباع واطاعت میں ہے، اسی میں حقیقی سعادت مندی ہے، دلوں کا سکون ہے اور ہمیشہ کی راحت وفلاح ہے۔

﴿وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ ٱلرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمْ عَنْهُ فَٱنتَهُوا۟ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴿٧﴾﴾ [الحشر: ۷]

"اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے"۔[سورۂ حشر:۷]

ظاہری اور باطنی پاکیزگی

قرآنِ کریم نے ہمیں ظاہر و باطن، دونوں کو گناہوں سے پاک صاف رکھنے کا حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَذَرُوا۟ ظَـٰهِرَ ٱلْإِثْمِ وَبَاطِنَهُۥٓ ۚ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكْسِبُونَ ٱلْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا۟ يَقْتَرِفُونَ ﴿١٢٠﴾﴾ [الأنعام: ۱۲۰]

"اور تم ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو۔ بلاشبہ جو لوگ گناہ کرتے ہیں، انہیں ان تمام جرائم کی جلد ہی سزا ملے گی جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے"۔[سورۂ انعام:۱۲۰]

باطنی صفائی یہ ہے کہ دل کو شرک سے، معصیت سے، کینہ و حسد سے، بغض و عناد سے، بدگمانی و بدنیتی سے، بدخواہی و ناشکری سے، نفاق اور کبر و غرور سے اور ریا اور خود پسندی سے پاک کیا جائے اور اس دل کو توحید سے اور اخلاص سے، تواضع وانکساری سے، نیک نیتی اور شکر گزاری سے اور توبہ واستغفار سے آراستہ کیا جائے۔

ظاہری طہارت و پاکیزگی کے لیے وضو اور غسل کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی ہیں، جنھیں انسانی فطرت کہا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ، وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ، وَالسِّوَاكُ، وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ، وَقَصُّ الْأَظْفَارِ، وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ، وَنَتْفُ الْإِبِطِ، وَحَلْقُ الْعَانَةِ، وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ» قَالَ الرَّاوِيْ: وَنَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ «الْمَضْمَضَةَ». [رواه مسلم]

"دس چیزیں فطرتِ (انسانی) میں سے ہیں: مونچھیں کتروانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک سے پانی کھینچنا (اور جھاڑنا) ناخن تراشنا، انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا، بغل کے بال اکھیڑنا، زیرناف کے بال مونڈنا، پانی سے استنجاء کرنا"۔ راوی کہتے ہیں کہ دسویں بات میں بھول گیا، شاید وہ "کلی کرنا ہو"۔ [مسلم شریف]

اس حدیث پاک میں داڑھی کو خصالِ فطرت میں شمار کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیائے کرام نے داڑھی رکھی، تمام صحابۂ کرامؓ نے رکھی، تمام سلفِ صالحین نے رکھی، اس لیے ہر مسلمان مرد اس کا مکلف ہے کہ وہ اس شعار کو اپنے چہرے پر سجائے، پورے فخر واعتماد کے ساتھ اس مبارک سنت پر عمل کرے، اخلاص واحتساب کو مدنظر رکھے، یعنی یہ عمل رضائے الٰہی کے لیے کرے، تاکہ اجر و ثواب کا مستحق ہو سکے۔

* * *

۱۴۳۳/۶/۲۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام کی پسندیدہ شخصیت

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں خیر و شر، موت وحیات اور فسق وفجور، اور سلوک واحسان اور توحید و شرک اور حلال و حرام جیسی متضاد چیزیں پیدا کر کے انسان کا امتحان لیا ہے، اچھائی اور برائی کے نمونے ظاہر کر کے انسان کو اختیار دے دیا ہے:

﴿وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ ﴿١٠﴾﴾ [البلد: ١٠]

''اور ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دیے ہیں''۔[سورۂ بلد:۱۰]

ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستے پر زبردستی اس کو نہیں چلایا، بلکہ دونوں راستے دکھا کر، ان کے انجام بتا کر ان پر چھوڑ دیا۔

﴿فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الكهف: ٢٩]

''اب جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کرے''۔

[سورۂ کہف:۲۹]

اپنے نفس کو پاکیزگی کا درس دے کر جو صحیح رخ پر اسے لے جائے گا اسے فلاح ملے گی اور جو اسے گناہوں اور برائیوں کا خوگر بنا کر وقتی اور ناجائز لذتوں کے پیچھے پڑے گا وہ

بلاشبہ ناکام ونامراد ہوگا۔

﴿قَدۡ أَفۡلَحَ مَن زَكَّىٰهَا ۝٩ وَقَدۡ خَابَ مَن دَسَّىٰهَا ۝١٠﴾

[الشمس: ٩ — ١٠]

”فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے، اور نامراد وہ ہوگا جو اس کو (گناہ میں) دھنسادے“۔[سورۂ شمس:۹-۱۰]

خیر کے دروازے بھی کھلے ہیں اور شر کے دروازے بھی

خیر کے سارے دروازے ہمارے سامنے کھلے ہوئے ہیں، اسی طرح شر کے دروازے بھی ہر طرف سے کھلے ہوئے ہیں۔ انسان کے ضمیر کا امتحان جتنا سخت عہدِ حاضر میں ہوا ہے، شاید ماضی میں کبھی نہ ہوا ہو، کیوں کہ اس وقت پوری دنیا ایک گاؤں اور ایک شہر کی طرح ہوگئی ہے، برے معاشرے کی تمام برائیاں صالح معاشرے میں بآسانی پہنچ رہی ہیں، اخلاقی انحطاط کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو انسان کی دست رس سے باہر ہو، خواہ مخواہ بھی ایمان سوز اور اخلاق سوز مناظر بلا اجازت ہر گھر اور ہر معاشرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

شرور وفتن سے کون بچے گا؟

اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال نہ ہو تو کوئی شخص ان فتنوں سے محفوظ نہیں رہ سکے گا، پھر یہ بھی ناگزیر ہے کہ انسان اپنے تدیُّن میں پختہ اور مخلص ہو، اپنی شخصیت میں یکتا اور طاقت ور ہو، اس کے اوپر خود اس کے ضمیر کا پہرہ ہو۔ یہ روحانی اور ایمانی قوت جب کسی

بندے کو حاصل ہو جائے تو وہ تمام منکرات اور فسق وفجور کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے، اس کے دل ودماغ میں ان برائیوں اور گناہوں کی ایسی حقارت اور نفرت بیٹھ جائے گی کہ وہ ان کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا، اس کا اسلامی اور روحانی تشخص، گناہوں اور فتنوں کے سامنے پتھر کی چٹان سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوگا، لیکن اگر انسان کی شخصیت کمزور ہو، ایمانی غیرت وحمیت کی کمی ہو اور اس کے اندر روحانی طور پر قوت مدافعت نہ ہو تو وہ فتنوں اور دل لبھانے والے پرکشش نقشوں میں الجھ کر اپنی آخرت برباد کر لے گا:

﴿ قُلْ إِنَّ ٱلْخَٰسِرِينَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۗ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْخُسْرَانُ ٱلْمُبِينُ ﴿١٥﴾ ﴾ [الزمر: ١٥]

”کہہ دیجیے کہ حقیقی خسارے میں پڑنے والے وہی ہیں، جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو قیامت کے دن خسارے میں ڈالا۔ یاد رکھو کہ کھلا ہوا خسارہ وہی ہے“۔[سورۂ زمر:۱۵]

یہ طاقت ور اسلامی شخصیت کبھی بھی توحید پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی، خواہ اسے قتل کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر سکتی۔ یہی وہ ایمانی اور روحانی قوت ہے جو مردِ مومن کو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے پر مجبور کرتی ہے، یہ قوت اسے رات کے اندھیرے میں نرم بستر سے اٹھا کر اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔

﴿ وَمِنَ ٱلَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِۦ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ [الإسراء: ٧٩]

”اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کرو، جو تمہارے لیے ایک اضافی عبادت ہے“۔[سورۂ بنی اسرائیل:۷۹]

حضرت حبیب بن زیدؓ کی صلابتِ ایمانی کا بے مثال واقعہ

یہ ایمانی قوت وصلابت جب اوجِ کمال کو پہنچتی ہے تو قربانی اور فدائیت کی ایسی مثالیں پیش کرتی ہے جس کے سامنے انسان انگشت بدنداں؛ بلکہ سراپا حیرت واستعجاب بن جاتا ہے، اس کی ایک مثال رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتہ صحابی حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہے۔

ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قاصد بنا کر یمامہ کے مسیلمہ کذاب کے پاس بھیجا، اس کذاب نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا، لوگوں کو گم راہ کرنے لگا تھا، جب پانی سر سے اوپر ہونے لگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کی سرکشی اور ظلم وزیادتی سے روکنے کے لیے حضرت حبیب کو اپنا خطاب دے کر روانہ فرمایا، انہوں نے آپؐ کا خطاب لیا اور مسیلمہ تک پہنچ کر اس کے حوالے کر دیا جب اس نے خط کا مضمون سنا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی، مارے غضب کے پاگل سا ہو گیا، اور اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ اس قاصد کو دوسرے روز چاشت کے وقت اس کے دربار میں لایا جائے، چناں چہ دوسرے روز وہ بدبخت اپنی مجلس میں بیٹھا اور دائیں بائیں اپنے جلادوں کو کھڑا کر دیا، پھر اپنی عوام کو بھی بلوایا، اس کے بعد حضرت حبیبؓ لائے گئے، وہ نہایت سرفرازی اور ایمانی شان کے ساتھ، بغیر مرعوب ہوئے، بے خوف وخطر، پُروقار انداز میں چلتے ہوئے وہاں پہنچے، جب وہاں پہنچے تو اس بدبخت نے سوال کیا: کیا تم اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ محمد، اللہ کے رسول ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد، رسول اللہ ہیں۔ اس نے دوسرا سوال کیا: کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ انہوں نے اس کا جواب اہانت

آمیز انداز میں دیتے ہوئے کہا: مجھے تیری بات سنائی نہیں دے رہی ہے۔ یہ سن کر وہ غصے میں لال پیلا ہوگیا اور تلملاتے ہوئے اپنے جلاد سے کہا: اس کے جسم کا ایک حصہ کاٹ ڈالو، چناں چہ اس کے جلاد نے ان کے جسم کا ایک حصہ کاٹ دیا، وہ حصہ زمین پر گر پڑا۔ اب اس نے سوچا کہ اس اذیت ناک عذاب کے بعد اس کی رائے بدل جائے گی، اس لیے پھر سوال کیا: کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ محمد، اللہ کے رسول ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد، اللہ کے رسول ہیں۔ پھر اس نے سوال کیا: کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے کہا نہیں کہ تیری یہ بات سننے سے مرے کان عاجز ہیں۔ یہ سن کر اس نے اپنے جلاد کو کہا کہ اس کے جسم کا دوسرا حصہ کاٹ ڈالو، انہوں نے دوسرا حصہ بھی کاٹ دیا اور وہ حصہ زمین پر گر پڑا، پھر اس نے پہلے کی طرح سوال کیا، انہوں نے اسی طرح جواب دیا، لوگ ان کی صلابت، قوت اور حق پر اصرار وثابت قدمی کو دیکھ کر دہشت زدہ کھڑے ہیں۔ اس طرح ان کے مبارک جسم کا ایک ایک ٹکڑا زمین پر گرتا گیا، بالآخران کی روح، خالق حقیقی سے جا ملی، لیکن انہوں نے اپنے اصولوں سے سرے موانحراف نہیں کیا، عزیمت کے ساتھ حق پر قائم رہے۔ اللہ ان سے راضی ہو اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور رسول اکرم کا جوار نصیب فرمائے۔ لیکن حضرت خبیبؓ کی یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی، بلکہ دین کے لیے اور رضائے الٰہی کے لیے جو قربانی بھی دی جاتی ہے وہ رائیگاں نہیں جاتی، جلدی یا بدیر نتیجہ خیز ثابت ہو کر رہتی ہے۔ چناں چہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حبیب بن زیدؓ کی والدہ محترمہ نسیبہ المازنیہ اور تمام مسلمانوں کو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا کہ یہ اللہ کا دشمن کذاب مسلمانوں کے ہاتھوں بری طرح مارا گیا اور جہنم رسید ہوا۔

طاقت ور شخصیت کے طاقت ور فیصلے

مومن جس قدر اپنے ایمان وعقیدے میں پختہ ہوگا اور جس قدر اس کی شخصیت مضبوط اور طاقت ور ہوگی، اسی کے بقدر اس سے اعمال صادر ہوں گے، ایمان وعقیدے کا پکا انسان ہی ہر طرح کے باطل افکار ونظریات کا، بے حیا معاشرے کا اور پرفریب تہذیب وتمدن کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے گا۔

وہ نہایت دلیرانہ فیصلے کا حوصلہ رکھتا ہے، اگر خدانخواستہ نفس وشیطان کے دامِ فریب میں آکر کسی گناہ کا ارتکاب کرلیتا ہے تو یکایک اس کا ضمیر اسے بیدار کر دیتا ہے، پھر وہ اپنا درد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرکے پکی توبہ کرتا ہے اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اب وہ اللہ کی رضا کو اپنا مقصدِ زندگی بناکر اور رسولِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سیرت وکردار کو اپنا نمونہ بناکر زندگی گزارے گا۔ وہ یہ فیصلہ کرنے پر قادر ہوتا ہے کہ اب وہ جس راہ پر چلے گا وہ شر کے بہ جائے خیر، فسق وفجور کے بہ جائے تقویٰ شعاری وپاک بازی، بے راہ روی کے بہ جائے صلاح واصلاح اور سلامت روی، قطع رحمی کے بہ جائے صلۂ رحمی اور بدسلوکی کے بہ جائے حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق کا راستہ ہوگا۔ اگر اس کی زندگی میں انحراف پیدا ہوگیا تھا، آخرت فراموشی اور خدا سے دوری ہوگئی تھی اور اس کا سبب بے توفیق، بلکہ بدکردار دوست احباب تھے، تو وہ ان کی پرواہ کیے بغیر اپنی پاکیزہ اور شریفانہ زندگی کا آغاز کرتا ہے، اگرچہ اس کے پرانے دوست ناراض ہی کیوں نہ ہوجائیں، کیوں کہ اس کے پیش نظر آخرت کی دائمی زندگی ہوتی ہے، نہ کہ دنیا کی عارضی اور فانی زندگی، اس کی نگاہ میں یہ حدیث پاک ہوتی ہے:

«مَنِ الْتَمَسَ رِضَا اللهِ بِسَخَطِ النَّاسِ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، وَأَرْضَى عَنْهُ النَّاسَ، وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَا النَّاسِ بِسَخَطِ اللهِ، سَخِطَ اللهُ عَلَيْهِ وَأَسْخَطَ عَلَيْهِ النَّاسَ». [رواه ابن حبان]

”جو شخص لوگوں کی ناراضگی میں اللہ کی رضا کا طالب ہو، تو اللہ اس سے راضی ہوجائے گا، اور لوگوں کو بھی اس سے راضی کردے گا، اور جو شخص اللہ کی ناراضگی میں لوگوں کی رضا کا طالب ہو، تو اللہ اس سے ناراض ہوجائے گا اور لوگوں کو بھی اس سے ناراض کردے گا“۔[ابن حبان]

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اسلامی تاریخ میں ہمیں ایسے ایمان افروز واقعات ملتے ہیں، جنہیں پڑھنے اور سننے کے بعد رگوں میں ایمانی جرأت و شجاعت کی لہر دوڑ جاتی ہے، ان سے ایک طاقت ور اور بے باک اسلامی شخصیت کا تصور ہماری نگاہوں میں رقص کرنے لگتا ہے۔

فتح قادسیہ کا موقع تھا، اسلامی فوجوں کی قیادت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کر رہے تھے، ایرانی فوج کی قیادت رستم کر رہا تھا، اس نے صلح و مصالحت کے لیے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا کہ اپنا نمائندہ بھیجیں جس سے گفت و شنید ہوسکے، چناں چہ حضرت سعدؓ نے حضرت ربعی بن عامرؓ کو نمائندہ بنا کر بھیجا، رستم نے ان کو مرعوب کرنے کے لیے اپنا دربار اس طرح لگایا تھا کہ اپنا خیمہ ہیرے جواہرات سے مرصع کیا، فرش پر نہایت قیمتی قالین بچھائے، ان پر گاؤ تکیے لگائے، درمیان میں اپنا تخت بچھایا، سر پر چھتر سونے اور ہیرے کی جھالروں سے سجایا، اپنا بیش قیمت تاج پہن کر بیٹھا اور حضرت ربعیؓ کو آنے کی اجازت دی۔

حضرت ربعی ایک معمولی سے گھوڑے پر سوار ہوکر، اپنے پرانے کپڑے پہنے ہوے، اپنی تلوار کی نیام پر چیتھڑے باندھے ہوے اس کے دربار میں داخل ہوے، پھر اپنے گھوڑے کو ایک گاؤ تکیے میں باندھ کر اپنے نیزے کو قالین پر ٹیکتے ہوے اس میں سوراخ کرتے ہوے رستم کے قریب پہنچے۔

درمیان میں اس کے درباریوں نے ہتھیار اتار کر رستم کے قریب جانے کو کہا تو انہوں نے فرمایا: میں خود سے نہیں آیا، تمھاری طلب پہ آیا ہوں، لہٰذا اگر اسی حال میں جانے دو، تو جاؤں گا، ورنہ ابھی واپس ہوجاؤں گا، رستم کو جب یہ خبر پہنچی تو کہا کہ انہیں اسی طرح آنے دو جس طرح وہ چاہتے ہیں، جب وہ رستم کے قریب پہنچے تو اپنا نیزہ زمین پر مارا جو فرش کو آر پار کر کے زمین میں گڑ گیا۔ اس کے بعد رستم نے سوال کیا: تم لوگ اس ملک میں کس لیے آئے ہو؟ انہوں نے نہایت پر اعتماد لہجے میں جواب دیا:

> ”اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھیجا ہے، تاکہ لوگوں کو، بندوں کی غلامی سے چھٹکارا دلا کر اللہ کی بندگی کی طرف لائیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعتوں کی طرف لائیں اور مذاہب کے ظلم وستم سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لائیں“۔

یہ وہ اسلامی شخصیت ہے جو ہمارے لیے بھی نمونہ ہے، مسلمان کبھی بھی دنیاوی زیب وزینت اور اس کی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوتا، حق گوئی اور حق پسندی اس کی پہچان ہوتی ہے۔

آئینِ جواں مرداں ، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ہر بڑا اِقدام قوتِ ارادی کا طالب ہے

انسانی زندگی کے اہم فیصلے اور انسانی تاریخ کی قابل ذکر اور حیرت انگیز تبدیلیاں اسی وقت ممکن ہیں، جب انسان ہمت و شجاعت کے ساتھ طاقت ور شخصیت کا مالک ہو، اس کے اندر قوتِ ارادی ہو، قوتِ ادراک ہو اور زندگی گزارنے کے لیے صحیح اور درست رخ متعیّن کرنے کی صلاحیت ہو؛ کیوں کہ کم زور شخصیت اور کم زور ارادے کا انسان، ہر وقت تردد میں پڑا رہتا ہے، صحیح رخ کی تعیین میں لمبے عرصے تک الجھن کا شکار رہتا ہے، شکوک وشبہات کا سیاہ بادل اس کے دل ودماغ پر چھایا رہتا ہے، زندگی میں پیش آنے والے چیلنجوں اور نفس کو دامِ فریب میں لینے والے فتنوں کا مقابلہ تو کیا کرتا ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر اپنی عاجزی اور درماندگی کا اعتراف کر رہا ہوتا ہے، یہی در اصل کم زور انسان ہے، اگرچہ جسمانی اعتبار سے دیو ہیکل ہی کیوں نہ ہو۔

کم زور انسان کی ایک علامت یہ ہے کہ اوّلاً تو وہ شکوک وشبہات اور بدگمانیوں میں مبتلا رہتا ہے، اگر بمشکل کوئی فیصلہ کر بھی لے اور بعد میں معلوم ہو کہ فیصلے میں چوک ہو گئی تھی تو وہ آہ وفغاں کرنے لگتا ہے اور ندامت ومایوسی کے ساتھ یہ جملے دہراتا ہے کہ اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوا ہوتا، حالاں کہ یہ جملہ شیطان کا دروازہ کھولتا ہے، ایسی حالت میں یہ کہنا چاہیے: «قَدَّرَ اللّٰهُ، وَمَا شَاءَ فَعَلَ» ”یہ تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ تھا، جو اللہ نے چاہا وہ کیا“۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

«الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ، احْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ، وَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَلَا

تَعْجَزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ، فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلَكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ». [صحيح مسلم]

”طاقت ور مومن اللہ کے نزدیک بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے بنسبت کم زور مؤمن کے، البتہ خیر دونوں میں ہے (خواہ طاقت ور ہو یا کم زور) اپنے لیے نفع بخش چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، اللہ سے مدد طلب کرو، درماندہ اور مایوس نہ ہو، اور اگر تمھیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ نہ کہو کہ کاش میں ایسا کرتا تو ایسا ایسا نہ ہوتا، بلکہ یہ کہو: یہ اللہ کی تقدیر ہے، جو اس نے چاہا وہ کیا، کیوں کہ (لو) یعنی کاش! شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے“۔ [مسلم شریف]

غیبت، انسانی کم زوری کا دوسرا نام ہے

اسلام نے غیبت کو حرام کرکے دراصل انسانی شخصیت کی قوت کو اجاگر کیا ہے، عزتِ نفس اور شرافت وکرامت کا باوقار لباس عطا کیا ہے، کیوں کہ جو شخص اپنے دل کی بھڑاس، یا کینہ وعداوت کو کسی کے غائبانے میں دوسروں کے سامنے رکھے، اس کی برائی بیان کرے، اس کے عیوب اور پوشیدہ کم زوریوں کو کھولے، یقیناً ایک کم زور، بلکہ حقیر انسان ہے، جو اپنے مدّمقابل کے روبرو ہوکر گفتگو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لہٰذا اس کے غائبانے میں اس کی خامیاں بیان کرکے اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے: «الْغِيبَةُ شِيمَةُ الضِّعَافِ» یعنی غیبت کرنا کم زور لوگوں کی خصلت ہے۔

اصول پسندی اور استغناء

طاقت ور شخصیت کے عناصرِ قوت میں سے یہ بھی ہے کہ ایسا شخص اپنے اصولوں کا پابند ہوتا ہے، اپنی گفتگو اور معاملات میں صاف اور صریح ہوتا ہے، لوگوں سے کھلے دل کے ساتھ ملتا ہے، کسی کے رکھ رکھاؤ میں حق گوئی اور اصول پسندی سے دست بردار نہیں ہوتا، حق کے خلاف نہ کسی کی حمایت کرتا ہے نہ اسے برداشت کرتا ہے۔

طاقت ور شخصیت کا حامل اور غیرت مند انسان دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا، اس کی غیرت اور عزتِ نفس اسے برداشت نہیں کرتی کہ ”تماشائے اہل کرم“ دیکھتا رہے، بلکہ وہ خود اپنے دست وبازو کو حرکت میں لاتا ہے اور رزقِ حلال کے لیے تمام ممکنہ مباح وسائل کو بروئے کار لاکر اپنی معاشی حیثیت کو مضبوط کرتا ہے اور استغناء کے ساتھ عزت وشرافت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز سستی اور کاہلی کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتی، اس کے لیے چستی پھرتی اور حرکت کی ضرورت ہوگی، اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاجزی اور سستی سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ، وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَالْبُخْلِ وَالْجُبْنِ، وَضَلَعِ الدَّيْنِ، وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ».

[صحيح البخاري]

”اے اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں رنج وغم سے، عاجزی اور سستی سے، بخالت اور بزدلی سے، قرض کے بوجھ اور لوگوں کے غلبے سے“۔ [بخاری شریف]

* * *

۱۷/رجب/۱۴۳۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سفر اور مسافر — آداب و احکام

سفر انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے، جس کے بغیر زندگی کے بہت سارے مقاصد کا حصول ناممکن ہے، ہر چند کہ سفر کو حدیث پاک میں عذاب کا ایک ٹکڑا کہا گیا ہے، کیوں کہ سفر میں بہر حال وہ آرام و سکون میسر نہیں ہوتا، جو حضر میں ہوتا ہے، اپنے مقام کی بہت ساری چیزوں سے انسان محروم ہو جاتا ہے، تاہم اس کے بغیر چارہ بھی نہیں، یہ انسانی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔

اسلامی شریعت کا کمال یہ ہے کہ اس نے انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام حالات اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں اس کی بھرپور رہنمائی کی ہے، خواہ اس کی عبادات و معاملات ہوں، اخلاق و معاشرت ہوں یا سفر و حضر ہو — سفر سے متعلق بھی کچھ خصوصی احکام وآداب ہیں، اس کے فضائل و محاسن ہیں، سفر کے کچھ مثبت پہلو ہیں اور کچھ منفی پہلو بھی ہیں — ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ سفر سے متعلق اسلامی تعلیمات اور احکام کو معلوم کر کے ان پر عمل کرے، تاکہ سفر اس کے لیے خیر و برکت کا باعث بنے، نیز اس کے جو منفی پہلو ہیں، یا نقصانات اور ضرر رساں پہلو ہیں، ان سے بچ سکے۔

محاسنِ سفر

سفر کے محاسن میں سے ایک یہ ہے کہ مسافر، اللہ تعالیٰ کی ان آیات اور نشانیوں کو دیکھتا ہے جو اس نے اپنی قسم قسم کی مخلوقات میں ودیعت فرمائی ہیں، خواہ وہ زمین وآسمان کی تخلیق اور مختلف رنگ ونسل کے انسان ہوں، ان کے عادات واطوار ہوں، یا ان کے افکار ونظریات ہوں یا ان کی اپنی اپنی زبانیں اور ان کے اصول وآداب ہوں ـــ ان سب کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی، اس کی قدرتِ کاملہ اور اس کی جلالتِ شان کا مزید اعتراف کرتا ہے جس سے اس کی ایمانی کیفیات میں ترقی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿ وَمِنْ ءَايَـٰتِهِۦ خَلْقُ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَـٰفُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَٰنِكُمْ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَـَٔايَـٰتٍ لِّلْعَـٰلِمِينَ ﴿٢٢﴾ ﴾

[الروم: ٢٢]

”اور اس کی نشانیوں کا ایک حصہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں دانش مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں“۔ [سورۂ روم:۲۲]

سیر وسیاحت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تجربات ومشاہدات؛ نیز شب وروز، آب وہوا اور موسموں کی تبدیلیاں جو ایک باشعور انسان کے لیے چشم کشا اور بصیرت افروز ثابت ہوتی ہیں، شریعت اس کو پسند کرتی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، بلکہ جو لوگ کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی ان نشانیوں سے عبرت حاصل نہیں

کرتے ان پر سخت عتاب ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَفَلَمْ يَسِيرُواْ فِي ٱلْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَآ أَوْ ءَاذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى ٱلْأَبْصَـٰرُ وَلَـٰكِن تَعْمَى ٱلْقُلُوبُ ٱلَّتِي فِي ٱلصُّدُورِ ﴿٤٦﴾ ﴾ [الحج: ٤٦]

"تو کیا انہوں نے زمین میں سیر وسیاحت نہیں کی جس سے انہیں وہ دل حاصل ہوتے جو انہیں سمجھ دے سکتے، یا ایسے کان حاصل ہوتے جن سے وہ سن سکتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں"۔ [سورۂ حج:۴۶]

جو لوگ سیر وسیاحت کرتے ہیں، انہیں کائنات میں اللہ کی پھیلی ہوئی نشانیوں کو بنگاہِ عبرت دیکھنا چاہیے، گزشتہ قوموں کے اوپر آئے ہوئے مختلف احوال پہ نظر ڈالنی چاہیے، ان کے اوپر زور آوری کا دور آیا، پھر وہ کم زور ہوگئے، مال دار تھے، پھر نادار اور فقیر ہوگئے، تندرست تھے، پھر بیمار ہوگئے، زندہ تھے، پھر موت نے ان کا خاتمہ کردیا۔ سعادت مند انسان وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔

سفر کے معنی ہیں ظاہر ہونا اور کھُلنا، چوں کہ سفر میں دوسرے مقامات کے احوال ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح لوگوں کے اور رفقائے سفر کے احوال ظاہر ہوتے ہیں، ان کی اصل طبیعت کھل کر سامنے آتی ہے، ان کی خوش خلقی یا بد خلقی نمایاں ہوتی ہے، اسی لیے اس کا نام "سفر" رکھا گیا ہے۔

سفر کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دوست احباب اور اعزہ واقارب کی زیارت وملاقات کی سعادت ملتی ہے، جو مستقل عبادت ہے اور اس پر اجر وثواب مرتب

ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے ایسے بھائی سے ملاقات کے لیے سفر کرتا ہے جس سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتا ہو اور اللہ ہی کے لیے ملنا چاہتا ہو تو اسے یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ خود اللہ جل جلالہ اس سے محبت فرماتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«زَارَ رَجُلٌ أَخًا لَهُ فِي قَرْيَةٍ أُخْرَى، فَأَرْصَدَ اللهُ لَهُ عَلَى مَدْرَجَتِهِ، مَلَكًا فَلَمَّا أَتَى عَلَيْهِ، قَالَ: أَيْنَ تُرِيدُ؟ قَالَ: أُرِيدُ أَخًا لِي فِي هَذِهِ الْقَرْيَةِ، قَالَ: هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا؟ قَالَ: لَا، غَيْرَ أَنِّي أَحْبَبْتُهُ فِي اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، قَالَ: فَإِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكَ، بِأَنَّ اللهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَا أَحْبَبْتَهُ فِيهِ». [رواه مسلم]

"ایک شخص اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا جو دوسری بستی میں تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو اس کے راستے میں لگادیا، جب وہ شخص اس فرشتے کے سامنے آیا تو فرشتے نے کہا: کہاں جارہے ہو؟ اس نے کہا: میں اپنے ایک بھائی سے ملنا چاہتا ہوں جو اس بستی میں رہتا ہے۔ اس نے پوچھا: کیا اس کی وجہ سے کسی احسان کا بدلہ مقصود ہے (یعنی کوئی دنیوی غرض ہے؟) اس نے کہا: نہیں۔ مجھے تو صرف اللہ کے لیے اس سے محبت ہے۔ اس نے کہا: تو مجھے اللہ نے تمہارے پاس بھیجا ہے (یہ بتانے کے لیے) کہ اللہ بھی تم سے اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح تم اللہ کے لیے اس بھائی سے محبت کرتے ہو"۔ [مسلم شریف]

سفر میں یتیموں، مسکینوں، بیواؤں اور ضرورت مندوں کے احوال کا جائزہ، ان کی غم خواری، ان کے ساتھ ہم دردی اور ان کا تعاون بھی کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے جو بسا اوقات حضر میں میسر نہیں ہوتا۔ دنیاوی سفر کا ایک اہم نفع یہ ہے کہ وہ اخروی سفر کی یاد دلاتا

ہے، وہ اس کا تصور کرتا ہے کہ جس طرح عارضی طور پر ہم سفر کے لیے نکلے ہیں، اسی طرح ہم سب کے سب اس دنیا میں مسافر ہی ہیں، ہماری اصل منزل آخرت ہے، خواہ یہ سفر مختصر ہو یا طویل ہو، بہر حال اس کی ایک انتہا ہے، لہٰذا اس کی تیاری اور اس کے لیے زادِ سفر بھی ضروری ہے، تاکہ منزل تک بہ عافیت پہنچا جا سکے، اور اس کا بہترین توشہ تقویٰ ہے۔

سفر کے خصوصی احکام

اگر کوئی سفر کر رہا ہے تو سفر سے متعلق جو شرعی احکام ہیں انہیں جاننا بھی ضروری ہے، مثال کے طور پر مسافر کے لیے یہ اجازت ہے کہ رمضان کے فرض روزے چھوڑ دے اور بعد میں حالتِ حضر میں ان کی قضا کرے۔

﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ [البقرة: ١٨٤]

”پھر اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے“ (یعنی قضا کر لے)۔ [سورۂ بقرۃ:۱۸۴]

مسافر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سہولت یہ دی گئی ہے کہ نمازوں میں ”قصر“ کرے، یعنی چار رکعت والی فرض نمازیں دو رکعت ادا کرے، لہٰذا سفر کی نیت سے جب اپنی بستی یا اپنے شہر سے باہر نکل جائے تو قصر شروع کر دے، پھر اگر کسی دوسرے مقام پر پندرہ روز یا اس سے زیادہ (بقول احناف کے) یا چار روز یا اس سے زیادہ (بقول دیگر ائمہ کے) قیام کا ارادہ ہو تو وہاں قصر نہیں کرے گا، بلکہ پوری پڑھے گا؛ لیکن قصر صرف اس صورت میں ہے جب تنہا نماز ادا کرے یا خود امامت کرے؛ لیکن اگر مقیم امام کے پیچھے

پڑھے تو پوری پڑھے گا۔

﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي ٱلْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا۟ مِنَ ٱلصَّلَوٰةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ ۚ إِنَّ ٱلْكَٰفِرِينَ كَانُوا۟ لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿١٠١﴾﴾ [النساء: ١٠١]

”اور جب تم زمین میں سفر کرو اور تمھیں اس بات کا خوف ہو کہ کافر لوگ تمھیں پریشان کریں گے، تو تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو۔ یقیناً کافر لوگ تمھارے کھلے دشمن ہیں“۔[سورۂ نساء:۱۰۱]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِينَةِ إِلَى مَكَّةَ، فَكَانَ يُصَلِّي بِنَا رَكْعَتَيْنِ، حَتَّى رَجَعْنَا». [رواه أحمد والنسائي]

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لیے نکلے، چناں چہ آپؐ ہمیں دو رکعتیں نماز پڑھاتے تھے یہاں تک کہ ہم واپس آ گئے“۔ [احمد و نسائی]

سفر کے دوران شریعت کی طرف سے ایک سہولت یہ دی گئی ہے کہ مسافر نے طہارت کے ساتھ اگر موزے پہن لیے ہوں، تو تین روز تک ان پر مسح کر سکتا ہے، جب کہ یہ سہولت مقیم کے لیے صرف ایک روز کے لیے ہے۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں:

«جَعَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ

وَلَيَالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ، وَيَوْمًا وَلَيْلَةً لِلْمُقِيمِ». [رواه مسلم]

"(موزوں پر مسح کے سلسلے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں، اور مقیم کے لیے ایک دن اور رات مقرر فرمایا ہے"۔[مسلم شریف]

آدابِ سفر

کسی اہم مقصد کے لیے سفر کرنا ہو تو بہتر ہے کہ اس سے پہلے استخارہ کرلیا جائے، کیوں کہ استخارے کے بعد جب اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے تو عام طور پر اس عمل میں خیر وبرکت ہی ہوتی ہے اور عافیت وسلامتی رہتی ہے، اور اس لیے بھی کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، بلکہ آپؐ صحابۂ کرامؓ کو اس کی ترغیب دیتے تھے اور نہیں استخارے کی تعلیم اس طرح دیتے تھے جس طرح قرآنِ کریم کی سورتوں کی تعلیم دیتے تھے جیسا کہ بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

سفر کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ سفر سے قبل سچی پکی توبہ کرلے اور ہر گناہ سے اللہ کی بخشش طلب کرے یعنی استغفار کرے، کیوں کہ انسان کی عمر تو اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے، پتہ نہیں کہ آخری سفر کا وقت کب آجائے۔

لہٰذا اگر کسی پر ظلم کیا ہو یا کسی کا حق مارا ہو تو اس کا حق واپس کرے اور اس سے معافی طلب کرے، کسی کا قرض لیا ہو تو اسے ادا کرنے کی کوشش کرے، اگر سفر لمبا ہو تو بہتر یہ ہے کہ وصیت بھی لکھ لے اور اس پر کسی کو گواہ بنالے۔ بہتر یہ ہے کہ سفر کے لیے نکلنے سے قبل کچھ صدقہ کرلیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيتَةَ السُّوءِ».

[الترمذي]

"صدقہ، پروردگار کے غضب کو بجھاتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے"۔

اگر ممکن ہو تو جمعرات کے روز سفر کیا جائے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ جمعرات کو ہی سفر شروع کرنے کی تھی — اسی طرح اگر ممکن ہو تو صبح کے وقت سفر کا آغاز ہو کیوں کہ حضورؐ جب کوئی فوجی دستہ یا سریّہ روانہ فرماتے تھے تو صبح کے وقت میں۔

صبح سویرے اپنے مہم پر روانہ ہونے والوں کے لیے حضور ﷺ نے برکت کی دعا دی ہے، فرمایا:

«اللَّهُمَّ بَارِكْ لِأُمَّتِي فِي بُكُورِهَا». [الترمذي]

"اے اللہ میری امت کے دن کے شروع حصے میں برکت عطا فرما"۔

[ترمذی]

سفر کے آداب میں یہ بھی ہے کہ روانہ ہوتے وقت اپنے اہل وعیال، اعزہ واقارب، دوست احباب کی دین داری، امانت داری اور خاتمۂ اعمال کو اللہ کے سپرد کرے، یعنی سب کو اللہ کے حوالے کرتے ہوے یہ دعائیہ کلمات کہے:

«أَسْتَوْدِعُ اللهَ دِينَكُمْ وَأَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيمَ أَعْمَالِكُمْ».

[أحمد]

"میں تمہارا دین، تمہاری امانت اور تمہاری زندگی کا آخری عمل اللہ کے سپرد کرتا ہوں"۔[احمد]

اللہ تعالیٰ کے سپرد جب کوئی چیز کردی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کا نگہ بان ہوجاتا ہے، وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، کیوں کہ حضورؐ نے فرمایا:

«إِنَّ لُقْمَانَ الْحَكِيمَ كَانَ يَقُولُ: إِنَّ اللهَ إِذَا اسْتُوْدِعَ شَيْئًا حَفِظَهُ». [أحمد]

"لقمان حکیم علیہ السلام کہا کرتے تھے: جب اللہ کے حوالے کوئی چیز کردی جاتی ہے، تو اللہ اس کی حفاظت کرتا ہے"۔[احمد]

جو مقیم ہو وہ مذکورہ بالا دعا کے بدلے میں مسافر کو دعا دیتے ہوئے یہ کہے:

«زَوَّدَكَ اللهُ التَّقْوَى، وَغَفَرَ ذَنْبَكَ، وَيَسَّرَ لَكَ الخَيْرَ حَيْثُمَا كُنْتَ». [رواه الترمذي]

"اللہ تمہیں تقویٰ شعاری کا توشہ عطا کرے، تمہارے گناہ معاف فرمائے، اور تمہارے لیے خیر و بھلائی کو آسان فرمادے تم جہاں بھی رہو"۔[ترمذی شریف]

مناسب اور صالح رفیقِ سفر میسر آجائے تو کیا کہنا، ایسا رفیقِ سفر جو بوقت ضرورت دینی اور دنیوی امور میں معاون بنے، کوئی بھول چوک ہو تو اس پر تنبیہ کرے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا سفر کرنے سے منع فرمایا ہے، اگرچہ یہ حکم اس زمانے کا ہے جس زمانے میں وسائلِ سفر آج کی طرح میسر نہیں تھے، تنہا سفر کرنا نہایت پرخطر کام تھا، تاہم آج بھی تنہا سفر کے دوران جو مشکلات بعض دفعہ پیش آتی ہیں وہ مسافرین سے پوشیدہ نہیں ہیں، اس لیے سفر سے قبل، بالخصوص لمبے سفر سے قبل رفیقِ سفر کی جستجو میں لگے، تاکہ سفر کے دوران ایک دوسرے کے معاون رہیں۔

سفر سے متعلق دعائیں

جب اپنے گھر سے نکلے تو یہ دعا پڑھے:

«بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ»

کوئی شخص گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھ لے تو کہا جاتا ہے: ”تجھے ہدایت ملی، تیری (ضروریات کی) کفایت کی گئی، تجھے ہر بلا سے بچالیا گیا“۔[ابوداؤد شریف]

یہ دعا بھی پڑھے:

«اللَّهُمَّ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ، أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ، أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ، أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ». [الترمذي وأبوداؤد]

”اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں گم راہ ہوں یا مجھے گم راہ کیا جائے، میں کسی معصیت میں مبتلا ہوجاؤں یا مجھے معصیت میں مبتلا کردیا جائے، میں کسی پر ظلم کروں یا مجھ پر کوئی ظلم کرے، میں کسی کے ساتھ جاہلانہ حرکت کروں، یا کوئی اور میرے ساتھ جاہلانہ حرکت کرے“۔[ترمذی وابوداؤد]

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ جب بھی گھر سے باہر تشریف لے جاتے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاکر مذکورہ دعا پڑھتے تھے۔

جب سوار ہوجائے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہے، پھر ذیل کی دعا پڑھے:

«سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا، وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ، اللهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِي سَفَرِنَا هَذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوَى، وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضَى، اللهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هَذَا، وَاطْوِ

عَنَّا بُعْدَهُ، اللهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالْخَلِيفَةُ فِي الْأَهْلِ، اللهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ، وَسُوءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ». [رواه مسلم]

”پاک ہے وہ ذات جس نے اس (سواری) کو ہمارے لیے مسخر کردیا ہے، حالاں کہ ہمارے بس میں اسے قابو میں کرنا نہیں تھا، اور بے شک ہم لوٹ کر اپنے پروردگار کے پاس ہی جانے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم اپنے سفر میں نیکی اور تقویٰ کا آپ سے سوال کرتے ہیں، اور ایسے عمل کا سوال کرتے ہیں جو آپ کو پسند ہو، اے اللہ! ہمارے اس سفر کو ہمارے لیے آسان فرمادیجیے، اور ہمارے لیے اس کی دوری کو لپیٹ دیجیے۔ اے اللہ! آپ ہی سفر کے (بہترین) ساتھی ہیں، اور ہماری فیملی کے نگہ بان اور رکھوالے ہیں۔ اے اللہ! میں سفر کی تکان، غم ناک منظر اور مال اور اہل وعیال میں بری واپسی سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں“۔ [مسلم شریف]

جب سفر سے واپسی ہو تو اس وقت بھی یہی دعا پڑھی جائے اور اس میں یہ اضافہ بھی کیا جائے:

«آيِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ». [مسلم]

”ہم لوٹنے والے ہیں، توبہ کرنے والے ہیں، بندگی کرنے والے ہیں، اپنے رب کی تعریف کرنے والے ہیں“۔ [مسلم شریف]

مسافر کے لیے چند نصیحتیں

جن لوگوں کی دعائیں قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہیں، ان ہی میں سے ایک مسافر

بھی ہے، لہٰذا سفر میں دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، اپنی دنیا اور آخرت کی سعادت و بھلائی کی اور پوری امت کی خیر و سعادت کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِيهِنَّ: دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ، وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ، وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ عَلَى وَلَدِهِ». [رواه الترمذي]

”تین دعائیں قبول ہوتی ہیں، جن میں کوئی شک نہیں: مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور باپ کی دعا بیٹے کے لیے“۔[ترمذی شریف]

سفر میں اگر تین ساتھی ہوں تو مشورے سے ایک کو سفر کا ذمہ دار اور امیر بنالیں، حدیث پاک میں ہے:

«إِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوا أَحَدَهُمْ». [أبو داؤد]

”جب سفر میں تین شخص نکلیں، تو ان میں سے ایک کو امیر بنالیں“۔[ابوداؤد]

کسی بستی یا شہر میں داخل ہوں تو یہ دعا پڑھیں جس میں اللہ تعالیٰ سے اس بستی یا شہر کی خیر مانگی گئی ہے اور شر سے پناہ مانگی گئی ہے:

«اللهُمَّ رَبَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظْلَلْنَ، وَرَبَّ الْأَرَضِينَ السَّبْعِ وَمَا أَقْلَلْنَ، وَرَبَّ الشَّيَاطِينِ وَمَا أَضْلَلْنَ، وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَا ذَرَيْنَ، أَسْأَلُكَ خَيْرَ هَذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ أَهْلِهَا، وَخَيْرَ مَا فِيهَا، وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ أَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِيهَا». [النسائي]

فجر کی فرض نماز سے قبل سفر میں بھی دو رکعتیں سنت کی ادا کریں، نیز وتر کی نماز ہرگز نہ چھوڑیں، کیوں کہ یہ وہ نماز ہے جسے رسول اللہ ﷺ سفر و حضر میں ہمیشہ ادا

فرماتے تھے۔

جب سفر سے واپس ہوں تو جیسا کہ پہلے گزرا، تین بار تکبیر کہیں، پھر سفر کے وقت سوار ہوکر جو دعا پڑھی تھی وہ پڑھیں، اس کے بعد یہ پڑھیں:

«آيِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ».

سفر اور مسافر سے متعلق ایک اور سنت ہے جو تقریباً مہجور ہوچکی ہے، اس پر اگر مسافر عمل کرے تو بلاشبہ ایک ایسی سنت کے احیاء کا بھی ثواب ملے گا جو مٹ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر سے واپس ہوتے تو اپنے دولت کدے پر تشریف لے جانے سے پہلے مسجد میں داخل ہوتے اور دو رکعت نفل نماز ادا فرماتے، اس کے بعد اپنے دولت کدے پر تشریف لے جاتے۔ امام بخاری نے روایت نقل کی ہے:

«عَنْ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ ضُحًى دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ». [صحيح البخاري]

”حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ جب دن چڑھے سفر سے لوٹتے تو مسجد میں داخل ہوتے اور بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا فرماتے“۔

[بخاری شریف]

* * *

۲۶/رجب/۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذکرُاللہ — فضائل واقسام

مومن کا ایمان جب مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا تو اسی کے بقدر قرآن کریم اور ذکر اللہ سے اس کے دل میں انسیت بڑھتی چلی جائے گی اور جتنا ایمان کم زور ہوتا چلا جائے گا، اسی کے بقدر ذکر اللہ اور کتاب اللہ سے انسیت میں کمی ہوتی چلی جائے گی۔ یہ انسیت اور حلاوت، دراصل ثمرہ اور نتیجہ ہے طاعت کا، اسی لیے ہر طاعت گزار اور تقویٰ شعار انسیت اور حلاوت سے بہرہ مند ہوتا ہے، جب کہ گنہ گار شخص اس سے محروم ہوتا ہے، بلکہ اپنے دل میں ایک طرح کی وحشت محسوس کرتا ہے۔

مومن، طاعت میں، اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں، اللہ کے ساتھ خلوت ومناجات میں، اس کے ذکر وشکر اور حسنِ عبادت میں ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے حقیقی حلاوت وانسیت، اللہ کے ذکر کے سوا کسی چیز میں نہیں ملتی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”تم اپنا جائزہ لو کہ تین چیزوں میں تمہیں حلاوت محسوس ہورہی ہے یا

نہیں؛ نماز، ذکر اور تلاوتِ قرآن میں، اگر محسوس کر رہے ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو، ورنہ یہ سمجھ لو کہ دروازہ بند ہے"۔ [رواہ البیہقی ی شعب الایمان]

زباں پہ ذکر ہو اور زندگی کی شام ہو جائے

ایک اعرابی (صحرانشیں) صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوے اور عرض کیا:

«يَا رَسُولَ اللهِ، أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ ؟»

"اے اللہ کے رسول! سب سے افضل عمل کیا ہے؟"۔

آپ نے فرمایا:

«أَنْ تُفَارِقَ الدُّنْيَا وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللهِ».

[الترمذي وأحمد]

"کہ تم دنیا سے اس حال میں رخصت ہو کہ تمہاری زبان، اللہ کے ذکر سے تر ہو"۔ [ترمذی شریف و مسند احمد]

ایک اور صحابی آپؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا:

«يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ شَرَائِعَ الإِسْلَامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ، فَأَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ أَتَشَبَّثُ بِهِ، قَالَ: لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ». [رواه الترمذي]

"یا رسول اللہ! اسلام کے احکام تو بہت ہیں، آپ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجیے جس پر میں مضبوطی سے جما رہوں۔ آپؐ نے فرمایا: تمہاری زبان ہر وقت اللہ

کے ذکر سے تر رہے"۔[ترمذی شریف]

ذکرِ الٰہی کا رسیا، زندگی سے بیزار نہیں ہوتا

جسے کثرتِ ذکر کی عادت پڑ جائے، ذکر کی حلاوت محسوس ہونے لگے، اسے تنہائی میں بھی کسی طرح کی وحشت نہیں محسوس ہوگی، نہ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہوگا، کیوں کہ اسے پتہ ہے کہ یہ دنیا حقیقت میں آخرت کی کھیتی ہے، یہاں طاعات وعبادات کے ساتھ جتنی لمبی زندگی میسر ہوگی وہ نیکیوں کی مقدار میں اضافے کا سبب ہوگی، جنت میں حاصل ہونے والے درجات کی بلندی اور انعامات کی بہتات کا ذریعہ ہوگی۔

رسول اکرم ﷺ کی اسراو معراج کی رات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپؐ سے فرمایا:

«يَا مُحَمَّدُ! أَقْرِئْ أُمَّتَكَ مِنِّي السَّلاَمَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ الجَنَّةَ طَيِّبَةُ التُّرْبَةِ عَذْبَةُ المَاءِ، وَأَنَّهَا قِيعَانٌ، وَأَنَّ غِرَاسَهَا سُبْحَانَ اللهِ وَالحَمْدُ للهِ وَلاَ إِلَهَ إِلاَّ اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ». [رواه الترمذي]

"اے محمد! اپنی امت کو میرا اسلام کہہ دیں، اور انہیں بتادیں کہ جنت کی مٹی پاکیزہ، اس کا پانی میٹھا ہے اور وہ چٹیل میدان ہے، اور اس کی شجر کاری ہے: سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر"۔[ترمذی شریف]

کثرتِ ذکر علامت ہے جانبین سے محبت کی

اگر کسی کو ذکرِ الٰہی کی کثرت کی توفیق مل گئی، تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

اس سے محبت فرما رہے ہیں، وہ خود بھی اللہ سے محبت رکھتا ہے، اسی طرح اگر کوئی ذکر اللہ کا پابند ہے اور ہمہ وقت اس کے ذکر میں رطب اللسان ہے تو یہ یقینی بات ہے کہ خود اس بندے کا ذکر بھی رب ذوالجلال کے ہاں ہو رہا ہے، اسی وجہ سے بعض اہل معرفت کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہو جاتا ہے، جب میرا مولیٰ مجھے یاد کرتا ہے۔ پوچھا گیا: وہ کیسے؟ جواب دیا کہ جب مجھے اس کے ذکر کی توفیق میسر ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے وہ مجھے یاد کر رہا ہے، کیوں کہ ارشاد ہے:

﴿ فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۵۲]

''تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا''۔ [سورۂ بقرۃ:۱۵۲]

حدیث قدسی میں رسول اکرم ﷺ حق جل شانہ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں:

«وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي، فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ...».

[صحيح البخاري]

''جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، لہٰذا جب وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں، اور جب وہ مجھے کسی مجلس میں یاد کرتا ہے، تو میں اسے اس سے بہتر (فرشتوں کی) مجلس میں یاد کرتا ہوں''۔ [بخاری شریف]

جب کسی شخص کو دوامِ ذکر کی عادت پڑ جاتی ہے اور اس میں وہ حلاوت محسوس کرنے لگتا ہے، تو پھر یادِ الٰہی اس کے نزدیک غذائے روح بن جاتی ہے، اگر ذکر نہ کرے، تو روح، اپنی غذا کے لیے تڑپنے لگتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے جسم کو اس کی غذا نہ پہنچائی جائے، تو

جسم اپنی غذا کے لیے بے قرار ہوجاتا ہے، اگر غذا نہ ملے تو دبلا پتلا ہوکر بیمار ہوجاتا ہے۔

حضرت اُسید بن حُضیر کی قراءت اور فرشتوں کا نزول

حضرات صحابۂ کرامؓ کو یادِ الٰہی اور ذکر و مناجات اور نماز و تلاوت کا ایسا شغف تھا کہ وہ رات کے سناٹے کا انتظار کرتے تھے، تاکہ سکون کے ساتھ ذکر و مناجات میں مشغول ہوں۔ حضرت ابوسعید الخدریؓ نے حضرت عبد اللہ بن خبّابؓ سے بیان کیا کہ انہیں حضرت اسید بن الحضیرؓ نے اپنا قصہ سنایا: حضرت اسید ایک روز اپنے باڑے میں قراءت کررہے تھے، اچانک ان کا گھوڑا بدکنے لگا، انہوں نے پھر پڑھا، تو وہ دوبارہ بدکنے لگا، ایسا بار بار ہوا، یعنی جب وہ رک جاتے تھے تو گھوڑا بھی تھم جاتا تھا، جب پڑھنے لگتے تھے تو اچھلنے لگتا تھا۔ کہتے ہیں کہ میرا بیٹا یحییٰ میرے قریب سو رہا تھا، مجھے اندیشہ ہوا کہ گھوڑا اسے روند نہ ڈالے، اس لیے اٹھ کر اس کے پاس گیا تو اچانک چھتری جیسی چیز اپنے سر کے اوپر دیکھی جس میں چراغوں کی طرح روشنی تھی، وہ فضاء میں چڑھتی ہوئی اوپر کو چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ جب صبح ہوئی تو میں رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور سارا قصہ عرض کیا، آپ ﷺ نے سن کر فرمایا:

«تِلْكَ الْمَلَائِكَةُ كَانَتْ تَسْتَمِعُ لَكَ، وَلَوْ قَرَأْتَ لَأَصْبَحَتْ يَرَاهَا النَّاسُ، مَا تَسْتَتِرُ مِنْهُمْ». [صحيح مسلم]

”وہ فرشتے تھے جو تمہاری قراءت سن رہے تھے، اور اگر تم پڑھتے رہتے تو لوگ صبح انھیں دیکھ لیتے، وہ ان سے چھپ نہیں سکتے تھے“۔ [مسلم شریف]

ذکر کے چند فوائد

علامہ ابن القیمؒ نے ذکر کے متعدّد فوائد بیان کیے ہیں، ان میں سے چند منافع یہ ہیں:

> ”ذکر اللہ کے ذریعہ آفتیں دور ہوتی ہیں۔ آنے والی بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ آئی ہوئی مصیبتیں آسان ہوجاتی ہیں۔ ذاکرین کے اوپر اگر کوئی بلا آتی ہے تو وہ فوراً یادِ الٰہی کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ ناگہانی آفتوں کی کمر اللہ کی یاد کے ذریعہ توڑ ڈالتے ہیں، لہٰذا ذاکرین کے لیے ذکر، حقیقت میں جنت کا باغ ہے جس میں وہ سیر کرتے ہیں، وہ ان کی سعادت اور خوش بختی کا سرمایہ ہے جس کے ذریعہ تجارت کرتے ہیں۔ ذکر، رنجیدہ اور غم زندہ دل کو فرحت و مسرت بخشتا ہے۔ ذاکر (ذکر کرنے والے) کو مذکور (جس کو یاد کرتا ہے اس) سے ملا دیتا ہے، بلکہ ذاکر کو مذکور بنا دیتا ہے...“۔

زبان وقلب کے سوا جسم کے جتنے اعضاء ہیں، ان سے وقتی عبادات وابستہ ہیں، لیکن زبان وقلب کی عبادتیں وقتی نہیں ہیں؛ بلکہ دائمی ہیں، ان کے ذریعے اپنے معبود برحق اور محبوب حقیقی کو ہر وقت یاد کرنا مطلوب ہے، کھڑے، بیٹھے، لیٹے، یا چلتے پھرتے، ہر حال میں۔ ذکر، دلوں کو جلا بخشتا ہے اور صاف ستھرا کرتا ہے، اگر دل بیمار ہو تو ذکر اس کی بیماری کا حقیقی علاج ہے، جب ذاکر اپنے محبوب کا ذکر کرتے ہوے استغراقی کیفیت میں پہنچ جاتا ہے، تو مذکور و محبوب کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ اس سے ملنے کا مشتاق ہوتا ہے—جب ذکر کرتے ہوے ذاکر کے دل وزبان کے درمیان باہمی انسجام پیدا ہوجائے تو پھر اسے دوسری چیز یاد نہیں رہتی، پھر اللہ اس کا محافظ و نگہ بان بن جاتا ہے، وہ اس کے لیے ہر چیز کا

نعم البدل بن جاتا ہے ـــ؛ بلکہ وہ اس کا ہو جاتا ہے۔

ذاکرین کی زبانوں کو اللہ تعالیٰ ذکر کے ذریعہ زینت بخشتا ہے، انہیں منور اور روشن کرتا ہے، جیسے اہل نظر کی نظر کو نور وروشنی کے ذریعے مزین وآراستہ کرتا ہے، لہٰذا وہ زبان جو ذکر الٰہی سے غافل ہے، وہ اندھی آنکھ، بہرے کان اور مفلوج ہاتھ کی طرح ہے۔

فَنِسْيَانُ ذِكْرِ اللهِ مَوْتُ قُلُوبِهِمْ
وَأَجْسَامُهُمْ قَبْلَ الْقُبُورِ قُبُورُ
وَأَرْوَاحُهُمْ فِي وَحْشَةٍ مِنْ جُسُومِهِمْ
وَلَيْسَ لَهُمْ حَتَّى النُّشُورِ نُشُورُ

''اللہ کے ذکر کو فراموش کرنا دراصل ان کے دلوں کی موت ہے، اور ان کے جسم، قبریں ہیں (اصل) قبر سے پہلے۔ ان کی روحیں، ان کے جسم سے (مسلسل) وحشت میں ہیں، (اگر ذکر کی عادت نہیں ڈالی تو) وہ قیامت تک مردہ ہی رہیں گے''۔

صحیحین کی روایت ہے، رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

«مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ رَبَّه مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ»

''جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں کرتا، ان دونوں کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے''۔

عام طور پر مال ودولت یا اولاد کی وجہ سے انسان غفلت کا شکار ہو جاتا ہے، اسی

لیے ان کو "فتنہ" یعنی آزمائش کی چیز بتایا ہے، لہٰذا ان کی وجہ سے اگر کوئی ذکر اللہ سے غافل ہوگیا تو وہ خسارے میں پڑ گیا۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَٰلُكُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُكُمْ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَٰسِرُونَ ﴿٩﴾ ﴾

[المنافقون: ۹]

"اے ایمان والو! تمہاری دولت اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں، اور جو ایسا کریں گے وہ بڑے ہی گھاٹے کا سودا کرنے والے ہوں گے"۔ [سورۂ منافقون:۹]

تمام طاعات کا مقصد ذکر اللہ کا قیام

جتنی طاعتیں ہیں، ان تمام کا مقصودِ اصلی ذکر اللہ کا قیام ہے، اسی لیے ذکر کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل ہے، کیوں کہ وہ طاعات کا سر چشمہ ہے، طاعات کی روح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ ٱتْلُ مَآ أُوحِىَ إِلَيْكَ مِنَ ٱلْكِتَٰبِ وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ ۖ إِنَّ ٱلصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ ٱلْفَحْشَآءِ وَٱلْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ ٱللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ﴿٤٥﴾ ﴾ [العنکبوت: ٤٥]

"جو کتاب آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی گئی ہے، اس کی تلاوت کیجیے، اور نماز قائم کیجیے، بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے واقف

ہے“۔[سورۂ عنکبوت:۴۵]

اسی لیے جتنے اعمالِ صالحہ ہیں، ان کے ساتھ ساتھ ذکر کا تذکرہ ہے، یعنی ان اعمال کو ذکر کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ نماز کو ذکر سے مربوط کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكۡرِيٓ ١٤﴾ [طه: ١٤]

”اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو“۔[سورۂ طٰہٰ:۱۴]

روزے کے ساتھ بھی ذکر و دعا کا تذکرہ ہے، حج اور مناسکِ حج کے ساتھ بھی ذکر مذکور ہے، بلکہ حج کی روح، اس کا مغز اور مقصود ہی ذکر الٰہی کے قیام کو بتلایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«إِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ، وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، وَرَمْيُ الْجِمَارِ لِإِقَامَةِ ذِكْرِ اللهِ». [رواه أبوداؤد والترمذي وأحمد]

”بیت اللہ کا طواف، صفا مروہ کی سعی اور جمرات کی رمی کا مقصد ذکر اللہ کو قائم کرنا ہے“۔[ابوداؤد، ترمذی، احمد]

ذاکرین پر اللہ تعالیٰ کو فخر ہے

ذاکرین کے شرف کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے ان پر فخر فرماتے ہیں، اس سے بڑی عزت افزائی اور کیا ہوگی؟

حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کی ایک جماعت پر گزرے جو حلقہ لگائے ہوئے تھے، تو آپؐ نے فرمایا: «ما أجلسكم»؟ تمھیں یہاں کس چیز نے بیٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہم بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہے ہیں، اور اس کی حمد

بیان کرر ہے ہیں اس بات پر کہ اس نے ہمیں اسلام کا راستہ دکھایا اور ہم پر احسان فرمایا:

«قَالَ: آللهِ مَا أَجْلَسَكُمْ إِلَّا ذَاكَ؟ قَالُوا: وَاللهِ مَا أَجْلَسَنَا إِلَّا ذَاكَ، قَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ أَسْتَحْلِفْكُمْ تُهْمَةً لَكُمْ، وَلَكِنَّهُ أَتَانِي جِبْرِيلُ، فَأَخْبَرَنِي أَنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يُبَاهِي بِكُمُ الْمَلَائِكَةَ».

[رواه مسلم]

"آپؐ نے فرمایا: کیا تم اللہ کو گواہ بنا کر کہتے ہو کہ صرف اسی مقصد کے لیے بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا! بخدا ہم اس کے سوا کسی مقصد کے لیے نہیں بیٹھے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: میں نے تمہیں کسی تہمت کی وجہ سے قسم نہیں دی ہے، بلکہ میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور مجھے بتایا کہ اللہ عزوجل فرشتوں کے سامنے تمہارے اوپر فخر فرما رہے ہیں"۔ [مسلم شریف]

ذکر کی تین قسمیں

علامہ ابن القیمؒ نے لکھا ہے کہ ذکر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ثناء (۲) دعاء (۳) رعایۃ

(۱) ذکر الثناء: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے الفاظ سے یاد کیا جائے جن سے اس کی تعریف، تقدیس اور عظمت وکبریائی ظاہر ہو، مثال کے طور پر: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر۔

(۲) ذکر الدعاء: یہ ہے کہ ایسے الفاظ سے اللہ کو یاد کیا جائے جن سے سوال اور فریاد ظاہر ہو، مثلاً: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ

ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴾اسی طرح یوں کہے: «يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ» وغیرہ

(۳) ذکر الرعایۃ: یہ ہے کہ ذاکر، اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا تصور کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کرے جن سے حضوری اور معیت ظاہر ہو، مثال کے طور پر «اللّٰهُ مَعِيْ» یعنی اللہ میرے ساتھ ہے۔ «اللّٰهُ نَاظِرٌ إِلَيَّ» یعنی اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اس طرح کے تصور اور مراقبے سے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے استحضار، اس کے ساتھ ادب، اس کی محبت میں اضافہ ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اذکار ثابت ہیں وہ ان تینوں قسموں کو شامل ہیں، آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طرح بھی فرمایا ہے کہ جس میں صرف ثنا، حمد، اس کی تعریف و توصیف اور تعظیم و تکریم ہے۔ آپ نے دعائیہ انداز میں بھی ذکر فرمایا ہے جس سے سوال، التجا اور فریاد ظاہر ہے۔

گویا کہ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو بہ ظاہر دعائیہ ہیں؛ لیکن وہ ذکر بھی ہیں، اسی طرح کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو بہ ظاہر ذکر کے ہیں؛ لیکن وہ دعائیہ بھی ہیں، چناں چہ حدیث پاک میں وارد ہے:

«أَفْضَلُ الدُّعَاءِ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ». [الترمذي]

”بہترین دعا: الحمد للہ ہے“۔ [ترمذی شریف]

اللہ تعالیٰ کی تعریف بھی دعا ہے، کیوں کہ اس کی تعریف اور شکر گزاری نعمتوں میں اضافے کا سبب ہے، لہٰذا حمدِ باری کا مطلب مزید کا سوال ہے۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ سے کسی نے کہا کہ حمد و ثنا اور تعریف و توصیف کیسے دعا ہو سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیا تم نے اُمیہ بن الصَّلت (دور جاہلیت کا شاعر) کا شعر

نہیں سنا جس میں وہ عبداللہ بن جُدعان سے عطا مانگ رہا ہے:

أَأَذْكُرُ حَاجَتِي أَمْ قَدْ كَفَانِي * حَيَاؤُكَ إِنَّ شِيمَتَكَ الْحَيَاءُ
إِذَا أَثْنَى عَلَيْكَ الْمَرْءُ يَوْمًا * كَفَاهُ مِنْ تَعرُّضِهِ الثَّنَاءُ

''کیا میں اپنی ضرورت وحاجت کو بیان کروں یا آپ کی حیاء ہی میرے لیے کافی ہو جائے گی؟ بلاشبہ آپ کی خصلت حیاء ہے۔ جب آپ کی کسی نے تعریف کر دی تو سوال کے بہ جائے تعریف ہی اس کے لیے کافی ہو جائے گی''۔

یہ سن کر عبداللہ بن جُدعان نے اس کی مراد پوری کر دی۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ نے فرمایا کہ یہ مخلوق کا حال ہے کہ تعریف سن کر حاجت روائی کی جاتی ہے، تو پھر رب العالمین کی تعریف کی جائے تو وہ کس طرح نوازشوں کی بارش برسائے گا۔

❊ ❊ ❊

۱۴/شوال/۱۴۳۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حَبرُ الامۃ حضرت ابن عباسؓ ــــ سیرت وکردار

نوجوانی کی عمر

جوانی کا زمانہ قوت وطاقت، عزم وحوصلہ، امنگ وولولہ اور تعمیر وترقی کا زمانہ ہوتا ہے، جو شخص اپنی جوانی کی حفاظت کرلیتا ہے اور جوانی کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرلیتا ہے، وہ نیک نام ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنی قوم اور اپنے معاشرے کے لیے عظیم سرمایہ ہوتا ہے، نیز وہ خود پوری زندگی اس کا فائدہ اٹھاتا ہے اور عزت وعافیت کی زندگی گزارتا ہے؛ لیکن جو شخص اپنی جوانی کی قیمتی عمر کو ضائع کردیتا ہے، وہ بعد میں کفِ افسوس ملتا ہے، پچھتاتا ہے اور ندامت کے آنسو بہاتے ہوے دوبارہ جوانی کے لوٹنے کی تمنا کرتا ہے، حالاں کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ــ اسی لیے اسلام نے انسانی زندگی کے اس خاص مرحلے کو بڑی اہمت دی ہے۔ صحیحین کی روایت میں جن سات خوش نصیبوں کا ذکر ہے جو قیامت کے روز عرشِ الٰہی کے سایے میں ہوں گے جس دن عرش کے سایے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، ان میں خصوصیت کے ساتھ اس نوجوان کا ذکر ہے جس نے پنی جوانی اللہ کی

طاعت و عبادت میں گزاری ہوگی ـــ اسی طرح ایک روایت میں قیامت کے روز ابن آدم سے چار سوالوں کا ذکر ہے، ان میں بھی جوانی کا سوال ہے کہ جوانی کہاں لگائی، کس کام میں صرف کی؟ ایک اور روایت میں پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جاننے کی تاکید ہے، ان پانچ میں ایک یہ ہے کہ جوانی کو بڑھاپے سے پہلے غنیمت سمجھو ـــ جوانی کا مرحلہ ایسا مرحلہ ہوتا ہے جس میں دل و دماغ اور جسم و جان میں پوری توانائی ہوتی ہے، اگر اس توانائی کو انسان بروئے کار لائے تو اپنے لیے، اپنی فیملی کے لیے اور معاشرے اور قوم کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔

آج ایک ایسے نوجوان کا ذکر خیر کیا جائے گا جس کی مبارک سیرت و کردار کے تذکرے سے کتابیں بھری پڑی ہیں، جس کے بلند ترین کارناموں سے اہل علم کی مجالس آباد رہتی ہیں، جس نے اپنی نوعمری کے ایک ایک لمحے کو سنبھالا، اپنی ذہانت کے جوہر دکھائے، علم و فراست کا لوہا منوایا، یہاں تک کہ ان کے بزرگوں اور بڑی عمر کے باکمال اہل علم و فضل حضرات نے بھی ان کی عبقری شخصیت کو تسلیم کیا، چناں چہ انھوں نے تفسیر و حدیث اور فقہ کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا جس سے صدیوں سے امت فیض یاب ہوتی آرہی ہے، فیضانِ علم و معرفت کا ایسا چشمہ جاری کیا جو اہل علم کو مسلسل سیراب کر رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک کرتا رہے گا۔

یہ مبارک نوجوان ہیں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جو ہجرت سے تین سال قبل اس مشکل وقت میں پیدا ہوئے جب قریش نے بنوہاشم کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر رکھا تھا اور ان کا سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ جب ہجرت کا وقت آیا تو وہ

مدینہ پاک نہیں جا سکے تھے، کیوں کہ انہیں لے جانے والا کوئی نہیں تھا، کہتے ہیں:

«كُنْتُ أَنَا وَأُمِّي مِنَ الْمُسْتَضْعَفِينَ، أَنَا مِنَ الْوِلْدَانِ، وَأُمِّي مِنَ النِّسَاءِ».

”میں اور میری والدہ ”مستضعفین“ یعنی کم زور لوگوں میں سے تھے، میں تو بچہ تھا اور والدہ ایک خاتون تھیں“۔ [بخاری شریف]

حجۃ الوداع کے موقع پر وہ بھی حج کے لیے گئے ہوئے تھے، کہتے ہیں:

«أَقْبَلْتُ، وَقَدْ نَاهَزْتُ الْحُلُمَ، أَسِيرُ عَلَى أَتَانٍ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ قَائِمٌ يُصَلِّي لِلنَّاسِ بِمِنًى». [صحيح البخاري]

”میری عمر بلوغ کے قریب تھی، میں اپنی گدھی پر سوار ہو کر آیا اور اس وقت رسول اللہ ﷺ منی میں کھڑے نماز ادا فرما رہے تھے“۔ [بخاری شریف]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت حضرت عبد اللہ کی عمر تیرہ سال کی تھی۔

ابن عباسؓ کا خوب صورت جواب
اور حضور ﷺ کی ان کے علم وفہم کے لیے دعا

حضرت ابن عباس بچپن سے ہی ذہین وفطین تھے، بیدار ذہن، حاضر جواب اور بے انتہا فہم وفراست کے مالک تھے، فہم وفراست کے ساتھ ساتھ ادب واخلاق نے ان کی شخصیت کو پرکشش، باوقار اور ہر دل عزیز بنا دیا تھا — ایک بار حضور ﷺ تنہا نماز ادا فرما رہے تھے، انہوں نے آپؐ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو دل چاہا کہ آپ کے ساتھ نماز

پڑھیں، چناں چہ آپؐ کے پیچھے کھڑے ہوکر نیت باندھ لی، آپؐ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے سے کھینچ کر اپنے برابر کھڑا کر دیا، پھر جب حضور ﷺ نماز میں مشغول ہوگئے تو یہ آہستہ سے پیچھے ہوگئے، جب آپؐ نے سلام پھیر لیا تو ابن عباسؓ سے فرمایا:

«مَا شَأْنِي أَجْعَلُكَ حِذَائِي فَتَخْنِسُ» ”کیا بات ہے، میں تو تمھیں اپنے برابر کھڑا کر رہا ہوں اور تم پیچھے کھسک جا رہے ہو؟ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے جواباً عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا کسی کے لیے یہ سزاوار ہے کہ وہ آپ کے برابر کھڑا ہو، حالاں کہ آپؐ اللہ کے ایسے پیغمبر ہیں جنھیں اللہ نے بہت کچھ عطا فرمایا ہے؟ چناں چہ حضور ﷺ کو میرا جواب پسند آیا اور آپؐ نے میرے علم وفہم میں اضافے کی مجھے دعا دی“۔[احمد]

تیرہ سال سے کم عمر بچے کے اندر اتنی سمجھ اور ایسا ادب، پھر استفار پر خوب صورت جواب؟ یقیناً حیرت انگیز اور تعجب خیز بھی ہے۔

”یہ نوجوان مجھ سے زیادہ سمجھ دار نکلا“...

عام طور پر نوخیز لڑکوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل سے بے خبر ہوکر صرف اپنے عہد حاضر میں اور کھیل کود میں مست ہوتے ہیں، ان کا شعار ہوتا ہے: «عِشْ وَقْتَكَ، ولاَ تَنْظُرْ أمامَك» یعنی فی الحال موج کرو، آگے کی مت سوچو، نہ سر اٹھا کر دور نگاہ ڈالو۔ ”بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“۔ لیکن ان ہی میں کچھ خوش بخت، زیرک اور سعادت مند ایسے ہوتے ہیں جو دور رس ہوتے ہیں، حوصلہ منداور باہمت ہوتے ہیں،

مستقبل میں کامیابی و کامرانی کے لیے ہمہ وقت فکر مند رہتے ہیں، ان ہی سعادت مندوں میں حضرت ابن عباس بھی تھے، عزم و حوصلے کے پہاڑ اور محنت و مجاہدہ کے خوگر تھے۔ خود اپنا قصہ بیان کرتے ہوے فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں نے ایک انصاری شخص سے کہا: ابھی صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، لہٰذا آؤ ہم ان سے احادیث معلوم کریں، (کیوں کہ کل جب یہ نہیں رہیں گے تو کس سے حدیث معلوم کریں گے) انہوں نے جواب دیا: تم بھی عجیب ہو ابن عباس! کیا تم سمجھتے ہو کہ ان اکابر صحابہ کے ہوتے ہوے لوگ تم سے علم حاصل کرنے کے لیے آئیں گے؟ انہیں تمہاری ضرورت پیش آئے گی؟ — وہ تو چلے گئے، لیکن میں حصول علمِ حدیث کی طرف متوجہ ہوگیا، چناں چہ جب مجھے معلوم ہوتا کہ کسی کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے، تو میں ان کے در پہ حاضر ہوتا، وہ قیلولہ کر رہے ہوتے تو میں اپنی چادر کا تکیہ بناکر ان کے دروازے کے پاس لیٹ جاتا، ہوا کے جھونکے کی وجہ سے میرے چہرے پر خوب مٹی پڑتی، جب وہ گھر سے نکلتے تو مجھے دیکھ کر کہتے: اے رسول اللہؐ کے عم زادے! کیسے تشریف لانا ہوا؟ آپ مجھے بلا لیتے، میں خود حاضر ہوجاتا۔ تو میں عرض کرتا: علم حاصل کرنے کے لیے میں ہی اس کا حق دار تھا کہ خود حاضر ہوجاؤں — کہتے ہیں کہ ایک وقت آیا جب اس شخص نے جس سے میں نے ساتھ مل کر علم حاصل کرنے کو کہا تھا، میرے ارد گرد لوگون کا جم غفیر دیکھا جو حصولِ علم کے لیے آئے تھے تو کہا:

«كَانَ هَذَا الْفَتَى أَعْقَلَ مِنِّي» ''یعنی یہ نوجوان، مجھ سے زیادہ سمجھ دار نکلا''۔ [رواہ الدارمی وصححہ، وقال: علی شرط البخاری]

علم پسند زبان اور فہیم دل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا اپنا خاص منہج تھا حصولِ علم کے سلسلے میں، چناں چہ وہ ہر مسئلے کی خوب تحقیق کرکے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے، زیاہ سے زیادہ مصادرِ علم، سرچشمہ ہائے تفسیر وحدیث کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے، اسی لیے ان کے مشایخ صحابہ کی بڑی تعداد ہے جن سے انہوں نے علم حاصل کیا، خود ہی بیان کرتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ایک مسئلے سے متعلق تیس صحابۂ کرام سے دریافت کرتا اور ان کی باتوں کو نوٹ کرلیتا۔

کسی نے ان سے دریافت کیا کہ اتنا گہرا اور وسیع ترین علم آپ نے کیسے حاصل کیا؟ انہوں نے جواب دیا: «بِلِسَانٍ سَؤُولٍ، وَقَلْبٍ عَقُولٍ» کثرت سے سوال کرنے والی زبان، یعنی علم پسند زبان اور قلبِ فہیم کے ذریعہ۔ مزید کہا کہ میں انصار ومہاجرین میں سے اکابر صحابۂ کرام کی خدمت میں کثرت سے حاضر ہوتا اور ان سے علم حاصل کرتا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ علم عطا فرمایا۔

حضرت عمرؓ کی مجالس میں حضرت ابن عباس کا مقام ومرتبہ

حضرت ابن عباسؓ کی عمر بڑھتی گئی اور عمر کے ساتھ ساتھ عقل وخرد اور علم ومعرفت میں بے پناہ وسعت وگہرائی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ بڑے بڑے صحابۂ کرام بھی ان کے علم وفضل کا اعتراف کرنے لگے، ایک بار حضرت عمرؓ نے ان کو مخاطب کرتے ہوے کہا: «لَقَدْ علمتَ علماً ما علمناه» تم علم کے اس مرتبے پر پہنچ گئے

جہاں ہم نہیں پہنچ سکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایک اصول یہ بنایا تھا کہ حکومت کے انتظام وانصرام میں اہل علم اور اہل فہم وفراست سے تعاون لیتے تھے، اپنی مجلسوں میں ان کو مخصوص مقام دیتے تھے، قطع نظر اس سے کہ ان کی عمر کیا ہے اور ان کا حسب ونسب کیا ہے۔ چناں چہ جب انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ذہانت وذکاوت اور علمی فضل وکمال دیکھا، ان کی رائے کی پختگی اور نگاہ کی دوررسی دیکھی توان کو اپنے مخصوص لوگوں میں شامل کرلیا، بلکہ اپنا رازدار بھی بنالیا، جب کہ ان کی عمر ابھی بیس سال سے کم تھی، اس نوعمری میں سیاسی اور حکومتی سطح کے مشورے ان سے لیا کرتے تھے۔ حضرت یعقوب بن زید کہتے ہیں:

«كَانَ عُمَرُ يَسْتَشِيرُ ابْنَ عَبَّاسٍ فِي الأَمْرِ إِذَا أَهمَّه»

حضرت عمرؓ کو جب کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تھا توابن عباسؓ سے مشورہ طلب کرتے تھے“۔

جب حضرت ابن عباسؓ بیمار ہوئے تو حضرت عمرؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور عیادت کرکے فرمایا:

”تمہاری بیماری سے ہمارا نقصان ہورہا ہے، اللہ ہماری مدد کرے“۔

کم سنی کے باوجود حضرت عمرؓ کی مجالس میں ان کے اکرام واعزاز کی وجہ سے بعض کبارِ صحابہ کو اعتراض ہوا کہ اس نوخیز لڑکے کو اکابر صحابہ پر کیوں فوقیت دی جاتی ہے، چناں چہ حضرت عمرؓ نے عملی طور پر ان کی فوقیت کی وجہ بتانے اور ان کو جواب دینے کا ارادہ کیا،

حضرت ابن عباس کہتے ہیں:

«كَانَ عُمَرُ يُدْخِلُنِي مَعَ أَشْيَاخِ بَدْرٍ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لِمَ تُدْخِلُ هَذَا الفَتَى مَعَنَا وَلَنَا أَبْنَاءٌ مِثْلُهُ؟»

”آپ اس نوجوان کو ہمارے ساتھ اپنی مجلس میں کیوں شریک کرتے ہیں، حالاں کہ اس کی عمر کے ہمارے بچے ہیں؟“۔

کہتے ہیں کہ ایک روز حضرت عمرؓ نے ان حضرات کو بلایا اور مجھے بھی ان کے ساتھ بلایا، میرا خیال ہے کہ انہوں نے مجھے اس روز صرف اس مقصد کے لیے بلایا کہ انہیں میری صلاحیت دکھلائیں، جب سب جمع ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے سوال کیا:

سورۃ النصر: «إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالفَتْحُ...» کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، یعنی اس سورت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ ایک صاحب نے کہا: جب اللہ کی نصرت اور فتح ہمیں مل جائے تو ہمیں اس کی حمد کرنے اور استغفار کرنے کا حکم ہے۔ کسی نے کہا کہ ہمیں معلوم نہیں، کسی نے خاموشی اختیار کرلی۔ پھر مجھ سے کہا: ابن عباس! کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ انہوں نے فرمایا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کا اشارہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ بتلایا ہے کہ جب اللہ کی نصرت اور فتح آپ کو حاصل ہوجائے (یعنی فتح مکہ) تو یہ آپ کی وفات کی علامت ہے، اب آپ اپنے رب کی پاکی بیان کریں، اس کی حمد کریں اور استغفار کریں، بلاشبہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے“۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: «مَا أَعْلَمُ مِنْهَا إِلَّا مَا تَعْلَمُ» مجھے بھی وہی معلوم ہے جو تمہیں معلوم ہے“۔ [بخاری شریف]

اس نوجوان کو اپنا شیخ کیوں بنایا؟

بعض تابعینؒ نے اکابر صحابہ کو چھوڑ کر ابن عباسؓ کو اپنا استاذ بنایا، ان کے حلقۂ علم میں پابندی سے آمد ورفت شروع کی، کیوں کہ انہیں حضرت ابن عباس کے علمی مقام ومرتبے کا اندازہ لگ چکا تھا۔ حضرت طاؤسؒ سے کسی نے سوال کیا: آپ نے بڑے بڑے صحابہ کو چھوڑ کر اس نوجوان لڑکے ابن عباس کو اپنا شیخ بنایا اور ان کے حلقۂ علم کے ہو کر رہ گئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر صحابہ کو دیکھا ہے کہ جب وہ کسی مسئلے میں الجھ جاتے تو ابن عباسؓ کے قول کو ترجیح دیتے تھے۔

حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں:

> ”میں نے عبداللہ بن عباسؓ کے فتوے سے بہتر کسی کا فتوی نہیں سنا، الا یہ کہ کوئی یہ کہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“۔

وقت کی حفاظت اور خشیتِ الٰہی

حضرت عبداللہؓ نے جو مقام ومرتبہ حاصل کیا تھا اور جو علم ومعرفت اپنے سینے میں جمع کیا تھا، اس کے پیچھے ایک بڑا راز یہ تھا کہ انہوں نے اپنے بچپن اور نوجوانی کی عمر کے ایک ایک لمحے کی حفاظت کی تھی، تحصیل علم کے لیے ہمیشہ سرگرداں رہے، خانوادۂ نبوت کے چشم وچراغ ہونے کے باوجود اپنے مشایخ کے ساتھ نہایت ادب وتواضع سے پیش آتے رہے۔ اس کے بعد نفع رسانی کے جذبۂ بے کراں کے تحت اپنے علوم سے خلق خدا کو

سیراب کرتے رہے، طالبانِ علومِ نبوت کا ہجوم ان کے حلقہ ہائے درس میں ہوتا تھا، ان کی علمی پیاس بجھاتے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مبارک علم نے ان کے اندر خشیتِ الٰہی پیدا کیا، دل کو موم بنادیا، صلاح وتقوے کا پیکر بنادیا، کیوں کہ اس علم کی وجہ سے دل میں خشیت پیدا ہوتی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى ٱللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ ٱلْعُلَمَٰٓؤُا۟ۗ﴾ [فاطر: ٢٨]

"اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں"۔ [سورۂ فاطر:۲۸]

حضرت ابورجاء العطاردیؒ کہتے ہیں:

«رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَسْفَلَ مِنْ عَيْنَيْهِ مِثْلَ الشِّرَاكِ الْبَالِي مِنَ الْبُكَاءِ» [سير أعلام النبلاء]

"میں نے ابن عباسؓ کو دیکھا کہ رونے کی وجہ سے ان کی دونوں آنکھوں کے نیچے چپل کے تسمے کی طرح نشان پڑ گیا تھا"۔ [سیر اعلام النبلاء]

حضرت ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک حضرت ابن عباس کی معیت میں رہا، جب کسی جگہ قیام کرتے تھے، تورات کے ایک حصے میں کھڑے ہوجاتے اور نماز ادا کرتے تھے، ایک رات یہ آیت پڑھنی شروع کی:

﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ ٱلْمَوْتِ بِٱلْحَقِّۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ ﴿١٩﴾﴾

[ق: ١٩]

اور موت کی سختی سچ مچ آنے ہی والی ہے، یہ وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا"۔

[سورۂ ق:۱۹]

بار بار اس آیت کو پڑھتے رہے اور روتے رہے — رضی اللہ عنہ وارضاہ—

نوجوانوں کے لیے صالح نمونہ

نوجوانوں کو کسی نہ کسی نمونے اور "قُدوَۃ" کی ضرورت ہوتی ہے، اگر صالح نمونہ ان کو پیش نہ کیا جائے تو غیر صالح نمونے کو اپنائیں گے، بلکہ فاسد اور تباہ کن نمونے کو اپنائیں گے، اس لیے تعلیم و تربیت کے ذمے داران کو چاہیے کہ امت کے نوجوانوں کے سامنے عبداللہ بن عباسؓ جیسا نمونہ پیش کریں، ان کے اندر علم و عمل، دانائی و پاک بازی اور تقویٰ شعاری کا داعیہ پیدا کریں۔ آج کل نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے کھلاڑیوں، گلوکاروں، اداکاروں اور اخلاق و کردار کے رہ زنوں کو اپنا نمونہ بنا رکھا ہے، جس کا لازمی نتیجہ ہمارے معاشرے کا بانجھ پن، تخلف اور ہر میدانِ عمل میں ناکامی ہے، لیکن اگر ہم ان نوجوانوں کے سامنے بطور نمونہ کے حضرت ابن عباسؓ، علی مرتضیٰؓ، ابوعبیدۃ بن الجراحؓ، خالد بن الولیدؓ اور ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ جیسے بلند پایہ اور حوصلہ مند، اہل جود و سخا، ہمت و شجاعت کے پہاڑ اسلاف کو پیش کریں گے تو معاشرہ صالح و پاکیزہ ہوگا، تعمیر و ترقی کی راہیں کھلیں گی، پھر امت اپنا کھویا ہوا ماضی دوبارہ بازیاب کرلے گی۔

ماہرین تعلیم و تربیت کی یہ ذمہ داری ہے کہ معاشرے کی ترقی کے لیے امت کے اس مخصوص طبقہ پر توجہ دیں، ان کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیں، ترقی کے لیے نشانِ راہ مقرر کریں، بالخصوص ذہین و فطین نوجوانوں پر فوکس کریں، ان کے اندر محنت و جفاکشی اور خودداری اور خوداعتمادی پیدا کریں —— اس مقصد کے لیے حضرات صحابۂ کرام اور اسلافِ امت کی سیرت و کردار کو پڑھنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کا عادی بنائیں، ان کو

اپنے قریب کریں، دعائیں دیں، ہمت افزا کلمات کہیں، جیسا کہ حضورؐ نے حضرت ابن عباسؓ کے اندر بچپن میں ہی ان کی ذہانت وذکاوت کو اپنی فراست سے تاڑ لیا تھا، خود حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک روز حضورؐ نے اپنے سینے سے مجھے لگایا اور یہ دعا دی:

«اللَّهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ» ”اے اللہ! اسے کتاب یعنی قرآنِ کریم کا علم عطا فرما“۔[بخاری شریف]

رضي الله عنه وعن جميع أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم.

***

۲۰/رجب/۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں شادی خانہ آبادی ـــــ تعلیمات وہدایات

دینِ فطرت

اسلام دین فطرت ہے، اس کے سارے احکام وقوانین فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہیں، وہ انسانی فطرت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے؛ لیکن نہایت شائستگی، شستگی اور صولوں کے ساتھ، نہایت پاکیزگی اور شرافت کے ساتھ — اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر صنفی خواہشات رکھی ہیں، ان کو اسلام نے ناپاک اور خبیث نہیں کہا، نہ انہیں شیطانی وسوسہ بتایا، نہ انہیں دبانے، کچلنے اور مارنے کی تعلیم دی، جیساکہ بعض ادیان ومذاہب نے انہیں ناپاک اور گندگی اور شیطانی مداخلت بتایا، بلکہ اسلام اسے ایک فطری چیز تصور کرتا ہے، البتہ اس نے اصول واحکام رکھے ہیں، تاکہ اس صنفی خواہش کو اس کے دائرے میں رکھ کر حلال وجائز طریقے سے پورا کیا جائے، تاکہ جس حکمت کے تحت اللہ نے اسے انسان کے اندر رکھا ہے، اس کی تکمیل ہو، یعنی نوعِ انسانی کا تسلسل خاندانی نظام کے ساتھ برقرار رہے، اور انسان، آوارگی سے بچ کر تہذیب وتمدن اور پاکیزگی کی زندگی گزارے، اس خواہش کو جنگل

کے درندوں کی طرح آزادانہ طور پر پورا کرنے کے بہ جائے خاندانی نظام کے تحت باشعور اور باحیاانسان بن کر پورا کرے۔

اس مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے اس واقعہ کو بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسے امام بخاری نے بھی ذکر کیا ہے کہ تین صحابۂ کرامؓ ایک مرتبہ ازواجِ مطہرات کے ہاں حضورؐ کے معمولات معلوم کرنے کے لیے گئے، جب انہیں آپ کے معمولات بتائے گئے توانہوں نے جو ذہن میں کثرتِ عبادات کا تصور قائم کیا تھا اس سے کم معلوم ہوے تو کہا کہ ہمارا مقابلہ حضورؐ سے کیسے ہوگا؟ حضور تو بخشے بخشائے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نمازیں پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا، تیسرے نے کہا کہ میں تو شادی ہی نہیں کروں گا اور کبھی عورتوں کے قریب نہیں جاؤں گا۔ جب حضورؐ کو خبر ملی تو آپ تشریف لائے اور فرمایا:

«أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا، أَمَا وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لله وَأَتْقَاكُمْ لَهُ، لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي». [صحيح البخاري]

”کیا تم لوگوں نے یہ باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، تم میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہوں؛ لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی بغیر روزے کے بھی رہتا ہوں) قیام اللیل بھی کرتا ہوں اور رات میں سوتا بھی ہوں، اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ پس جس نے میرے طریقے سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں“۔

[بخاری شریف]

نکاح کی ترغیب

اسلام نے نکاح کرنے کی ترغیب دی ہے، حلال طریقے سے صنفی اور جنسی خواہشات کی تکمیل پر زور دیا ہے، شادی کو آسان کرنے اور اس میں درپیش آنے والی دشواریوں کو دور کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَأَنكِحُواْ ٱلۡأَيَـٰمَىٰ مِنكُمۡ وَٱلصَّـٰلِحِينَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَإِمَآئِكُمۡۚ إِن يَكُونُواْ فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ ٱللَّهُ مِن فَضۡلِهِۦۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٞ ﴿٣٢﴾﴾

[النور: ۳۲]

”اور تم میں سے جو مرد عورت بے نکاح کے ہوں، ان کا نکاح کر دو، اور اپنے نیک بخت غلام اور لونڈیوں کا بھی، اگر وہ تنگ دست ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا۔ اور اللہ بہت وسعت والا ہے، سب کچھ جانتا ہے“۔

[سورۂ نور:۳۲]

نکاح کی ترغیب کے متعدّد اسباب ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ نکاح کر لینے کی وجہ سے انسان کی عفت و پاک دامنی برقرار رہتی ہے، نگاہوں کی حفاظت کا سبب ہے، شرم گاہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ ہے، الغرض اس کی وجہ سے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے، بے راہ روی ختم ہوتی ہے، اور یہ فطری بات ہے کہ حلال کو عام کیا جائے گا تو حرام پر خود ہی روک لگ جائے گی، اسی لیے رسول اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ

بِالصِّيَامِ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ». [صحيح البخاري]

"نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جسے نکاح کرنے کی مالی استطاعت ہو، اسے نکاح کرلینا چاہیے، کیوں ہ یہ نگاہ نیچی رکھنے والا اور شرم گاہ کو زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے — اور اگر کوئی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اسے کثرت سے روزہ رکھنا چاہیے، کیوں کہ روزہ اس کے لیے کسرِ شہوت کا ذریعہ ہے"۔ [بخاری شریف]

نیک مقصد کے تحت اگر کوئی نکاح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں، غیب سے اس کی ضروریات کا تکفّل فرماتے ہیں، کیوں کہ اس کے پیش نظر تقویٰ اور اپنی عفت وعصمت ہے، اور تقویٰ شعار بندے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کشادگی اور روزی کا وعدہ فرمایا ہے۔

﴿وَمَن يَتَّقِ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّهُۥ مَخْرَجًا ﴿٢﴾ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: ٢-٣]

"اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، تو اللہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا۔ اور اسے ایسی جگہ سے روزی دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا"۔ [سورۂ طلاق: ۲-۳]

اسی مفہوم کو رسول اکرمؐ نے بیان فرمایا ہے:

«ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللهِ عَوْنُهُمْ».

"تین شخص ہیں جن کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے لیا ہے".

"ان میں سے ایک وہ ہے جو پاک دامنی حاصل کرنے کے لیے شادی کرے"۔

«النَّاكِحُ الَّذِي يُرِيدُ العَفَافَ». [رواه الترمذي]

نکاح کے سلسلے میں اسلاف کے اقوال

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: « ابْتَغُوا الْغِنَى فِي النِّكَاحِ» یعنی نکاح میں غنی اور خوش حالی کی امید رکھو، یعنی اگر خوش حالی چاہتے ہو تو نکاح کرلو۔

[مسند الصدیق]

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

«أَطِيعُوا اللهَ فِيمَا أَمَرَكُمْ بِهِ مِنَ النِّكَاحِ، يُنْجِزْ لَكُمْ مَا وَعَدَكُمْ مِنَ الْغِنَى، قَالَ تَعَالَى: إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ».

"نکاح کے تعلق سے اللہ نے جو تمہیں حکم دیا ہے، تم اس کی اطاعت کرو، اس نے جو غنی کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ پورا کردے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر تم تنگ دست ہو تو وہ اپنے فضل سے تمہیں مال دار بنادے گا"۔

ابوالزوائد سے حضرت عمر بن الخطابؓ نے شادی میں تاخیر یا شادی نہ کرنے کی وجہ دریافت فرمائی، پھر خود ہی فرمایا:

«مَا يَمْنَعُكَ مِنَ النِّكَاحِ إِلَّا عَجْزٌ أَوْ فُجُورٌ»

"تمہیں نکاح سے باز رکھنے میں دو میں سے ایک وجہ ہوسکتی ہے؛ یا تو تم عاجز ہو، یا فسق وفجور میں مبتلا ہو"۔

حضرت عمرؓ یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ میری زندگی کے

صرف تین دن رہ گئے ہیں، تو میں کوشش کروں گا کہ ان میں نکاح کرلوں۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی اہلیہ محترمہ ام عبد اللہ کا انتقال ہوگیا، تو دوسرے روز ہی انہوں نے دوسرا نکاح کیا اور فرمایا:

«أَكْرَهُ أَنْ أَبِيتَ يَوْمًا عَزَبًا» ”مجھے یہ ناپسند ہے کہ ایک رات بھی کنوارپن کے ساتھ گزاروں“۔

توہّم پرست معاشرے کے لوگ تو اس واقعہ پر تعجب کا اظہار کریں گے اور یہ کہیں گے کہ انہیں نمائش کے طور پر پہلی بیوی کی وفات پر چند ماہ تک ماتم کرتے رہنا چاہیے تھا، لیکن قرآن وحدیث اور فقہ وعقائد کے ماہر، امامِ وقت حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے پہلی بیوی کی وفات پر سوگ منانے اور دوسری شادی کو معیوب سمجھنے کو غیر شرعی عمل سمجھا اور فوراً دوسری شادی کرنے کو اپنے زہد وتقویٰ اور عفت وعصمت کے لیے ضروری سمجھا۔

نکاح کے فوائد

نکاح اور شادی کے بہت سارے فوائد ہیں، میاں بیوی جب ایک ساتھ رہنے لگتے ہیں تو ان کی نگاہوں کی اور شرم گاہوں کی حفاظت ہوتی ہے، مزید یہ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سکون واطمینان کا سبب بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، قرآنِ کریم میں اس کو «سَكَن» کہا گیا ہے۔

﴿ وَمِنْ ءَايَـٰتِهِۦٓ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَٰجًا لِّتَسْكُنُوٓا۟ إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ﴾ [الروم: ٢١]

”اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے

بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس جاکر سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت کے جذبات رکھ دیے"۔[سورۂ روم:۲۱]

یہ سکون واطمینان صرف صنفی خواہشات تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ نفسیاتی اور جذباتی اور قلبی سکون کو بھی شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنی نبوت کے ابتدائی دور میں جب لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے تھے، تو ان کی طرف سے اذیت ناک اور الم ناک حرکتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ظلم وستم کے پہاڑ آپ پر گرائے جاتے تھے، پھر آپؐ نہایت غم زدہ اور افسردہ ہوکر گھر تشریف لاتے تو ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ آپ کو تسلی دیتیں، آپ کی غم خواری کرتیں اور محبت ومودت کی ایسی بارش برساتیں کہ آپ تمام مصائب وآلام کو بھول جاتے۔

اسی لیے نیک بیوی کو دنیا کا بہترین متاع کہا گیا ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

«الدُّنْيَا مَتَاعٌ، وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ».

[رواه مسلم]

"دنیا متاع ہے، اور بہترین متاعِ دنیا نیک بیوی ہے"۔[مسلم]

نکاح کا ایک اہم فائدہ، صالح اولاد کا وجود میں آنا ہے، تاکہ یہ اولادیں اپنے دین، اپنی قوم اور اپنے معاشرے کے لیے نفع رسانی کا ذریعہ بنیں، نیز خود والدین کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں، ان کے لیے دست وبازو بنیں، پھر ان کا بہترین وارث بنیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ».

"بہت محبت کرنے والی، بہت بچے جننے والی عورتوں سے شادی کرو، یقیناً

میں تمہاری کثرت سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا"۔ [ابوداؤد، نسائی، الحاکم]

نکاح کے فوائد میں سے ایک عورت کی تکریم ہے، اس کو ایک گھر میں عزت کے ساتھ رکھنا، اس کے نان ونفقے کی ذمے داری اٹھانا، اس کے آرام وراحت اور صحت وتندرستی کا خیال رکھنا اور اپنے گھر والوں پر یا معاشرے پر بوجھ بن کر زندگی گزارنے کے بہ جائے ایک دوسرے گھر کو آباد کرنا اور سعادت وخوش بختی کی زندگی گزارنا ہے، تاکہ مرد وعورت ایک دوسرے کی ہر طرح کی ضروریات کی تکمیل میں ہاتھ بٹائیں اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "لباس" بنیں۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَأَنتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّۗ﴾ [البقرة: ١٨٧]

"وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"۔

[سورۂ بقرۃ:۱۸۷]

اس تکریم کا صرف مادّی ہی فائدہ نہیں ہے؛ بلکہ اس پر اجر وثواب بھی مرتب ہوتا ہے جو اخروی سعادت کا ذریعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللهِ إِلا أُجِرْتَ عَلَيْهَا حَتَّى مَا تَجْعَلُ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ». [صحيح البخاري]

"بے شک اللہ کی رضا کے لیے جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس پر تمہیں اجر ملتا ہے، یہاں تک کہ جو (لقمہ) تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو اس پر بھی"۔

[بخاری شریف]

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہماری شریعت کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص حلال طریقے

سے اپنی شہوت پوری کرتا ہے تو اسے صدقہ کا اجر ملتا ہے۔ «وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ».

جب صحابۂ کرامؓ نے یہ حدیث سنی توعرض کیا: یارسول اللہ!

« أَيَأْتِي أَحَدُنَا شَهْوَتَهُ يَكُونُ لَهُ فِيهَا أَجْرٌ ؟ »

”ہم میں سے کوئی اپنی خواہشِ نفس پوری کرتا ہے توکیااس پر بھی اسے اجر ملتاہے؟“۔آپؐ نے فرمایا: ”بتاؤاگر یہ اپنی خواہش حرام جگہ پوری کرتاتواسے گناہ ہوتا؟اسی طرح اگر حلال جگہ پوری کرے گاتویقیناًاسے اجر ملے گا“۔

[مسلم شریف]

حلال کوآسان اور حرام کو مشکل کرو

لڑکے یالڑکیاں جب سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں، یااس سے تجاوز کرنے لگیں توان کے اندر صنفی خواہشات اور میلان کا پیدا ہونافطری بات ہے، لہٰذا شریعت ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ حلال طریقے سے رشتۂ ازدواج میں انہیں منسلک کریں، نکاح اور شادی کوآسان کریں اور بروقت اس کاانتظام کریں۔اگر نکاح کوآسان کریں گے تواخلاقی بے راہ روی اور حرام کاری سے انہیں بچاسکیں گے، کیوں کہ اگر حلال کوآسان نہیں کریں گے توحرام کادروازہ کھلے گا، بدکاری کے اڈے آباد ہوں گے، اخلاق وکردار کی گرفت ڈھیلی ہوتی جائے گی اور معاشرہ تباہ وبرباد ہوگا، بے حیائی وبے شرمی عام ہوگی۔

قرآنِ کریم نے بدکاری کے قریب جانے سے بھی منع کیاہے۔فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا۟ ٱلزِّنَىٰٓ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ فَـٰحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا ﴿٣٢﴾ ﴾

[الإسراء: ٣٢]

”اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، وہ یقینی طور پر بڑی بے حیائی اور بے راہ روی ہے“۔[سورۂ بنی اسرائیل:۳۲]

اسی طرح قرآنِ کریم نے قوم لوط کے برے فعل کی بھی سختی سے مذمت کی ہے، کیوں کہ وہ اپنی جنسی خواہشات اپنے ہم جنس کے ساتھ پورا کرتے تھے، جسے آج کل ”شذوذ جنسی“ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان لوگوں کے لیے ”مجرمین“، ”مفسدین“، ”جاہلین“ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں، ان پر اللہ کا ایسا سخت عذاب آیا تھا کہ ان کی بستی الٹ دی گئی اور آسمان سے پتھر ان پر برسایا گیا۔

اس طرح کی برائیوں سے بچنے کے لیے اسلام نے یہ تدبیر بتائی ہے کہ نامحرم کے محاسن کو اپنی نگاہوں میں نہ بسائیں، اگر پہلی نظر غلطی سے پڑ بھی جائے تو دوبارہ نظر نہ ڈالیں۔ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے اور شرم گاہوں کی حفاظت کا حکم دیا۔

دوسری طرف نکاح کو آسان کرنے کی تعلیم دی، اس سلسلے میں آنے والی دشواریوں کو ختم کرنے کا حکم دیا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا خَطَبَ إِلَيْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوهُ، إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الأَرْضِ، وَفَسَادٌ عَرِيضٌ». [ترمذي]

”جب تمہیں ایسا شخص پیغام دے جس کی دین داری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں، تو اس سے شادی کر دو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور عظیم فساد برپا ہو گا“۔[ترمذی شریف]

اس فتنے اور فساد کی وجہ یہی ہے کہ لوگ شادی کے معاملے میں ٹال مٹول کرتے

رہتے ہیں، وقت پہ رشتہ آتا ہے، لیکن قسم قسم کے حیلے بہانے بنا کر یا معمولی قسم کی باتوں کو عذر بنا کر انکار کر دیتے ہیں۔

شادی کے سلسلے کی رکاوٹیں

اسلام نے شادی کو بہت آسان بنایا تھا، آسان کرنے کی تعلیم دی تھی، کم خرچ والی شادی کو باعث خیر و برکت بتایا تھا، لیکن لوگوں نے اس آسان کام کو مشکل ترین بنا دیا، کسی معاشرے میں یہ مشکلیں لڑکی والوں کی طرف سے کھڑی کی جاتی ہیں، جب کہ دوسرے بعض معاشروں میں لڑکے والوں کی طرف سے، دونوں جگہوں پہ لوگوں نے اپنے بچوں کو سامانِ تجارت کے طور پر استعمال کیا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے ان کی خرید و فروخت ہو رہی ہے، ان کی قیمتیں لگائی جا رہی ہیں۔

بعض جگہوں میں لوگوں نے مہر کی بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کر کے اور لڑکے کے خرچ پر گراں ترین شادی ہالوں اور دلہن کی تیاری کے لیے غیر ضروری تقاضوں کے ذریعے لڑکوں کی کمر توڑ رکھی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک ان کے پاس اتنی رقم جمع نہیں ہو پاتی، اس وقت تک شادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا۔

بعض معاشروں کا حال اس کے برعکس ہے، وہاں بے شرم و بے حیاء لوگ لڑکی والوں سے مطالبات کرتے ہیں، یہ ”بے شرم“ اپنے لڑکوں کو سامانِ تجارت کے طور پر استعمال کرتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑکی کا باپ اگر نادار ہے، تو اس کی لڑکی ایک عرصے تک گھر میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں نظریے اسلام مخالف ہیں، دونوں کے خلاف سخت آواز اٹھانی

چاہیے، غیرت منداور باشعور لوگوں کواس کے خلاف منظم کوشش کرنی چاہیے، تاکہ حلال آسان ہو، اور حرام پر روک تھام ہو۔

ان لالچی اور طمع پسند لوگوں کی وجہ سے کتنے والدین ایسے ہیں، جن کی نیندیں حرام ہوچکی ہیں، غموں کے بار کی وجہ سے قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوچکے ہیں، ان کے چہروں کی مسکراہٹ چھن چکی ہے، گھروں کی رونق ختم ہوچکی ہے، کاش یہ لوگ سمجھتے کہ یہ سب کچھ دَین ہے، جس کو آج یا کل چکانا ہوگا۔

حدیث میں وارد ہے: «كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ» جیسا کروگے ویسا پاؤگے۔

[رواہ العجلونی فی کشف الخفاء بسند ضعیف]

لیکن اگر دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کروگے، تواللہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرے گا، مشکل حالات میں وہ تمہارا مشکل کشا بنے گا۔

آسان شادیوں کے چند نمونے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں شادی کو اتنا آسان کردیا گیا تھا کہ اس کی نظیر کسی معاشرے میں نہیں ملتی۔ ایک صحابی کا نکاح حضور ﷺ نے قرآنِ کریم کی چند سورتیں جوانھیں حفظ تھیں ان کو مہر کا عوض قرار دے کر کیا۔[بخاری شریف]

ایک صحابی نے نکاح کیا اور جو مہر مقرر کیا وہ کھجور کی گٹھلی کے بقدر سونا تھا، اس پر لڑکی والے راضی بھی ہوگئے، جب حضور ﷺ کو خبر ملی توآپ نے ان کے لیے برکت کی دعا دی اور فرمایا:

”ولیمہ کرو، خواہ ایک بکری ذبح کرکے ہی سہی“۔[متفق علیہ]

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علی مرتضیٰؓ سے کراتے ہیں اور مہر میں حضرت علی اپنی زرہ پیش فرماتے ہیں جسے میدانِ جنگ میں حفاظت کے لیے پہنتے تھے اور فریقین اس پر راضی ہوجاتے ہیں۔[ابوداؤدونسائی]

حضرت سعید بن المسیبؒ ایک جلیل القدر تابعی اور اپنے وقت کے ممتاز عالم دین ہیں، خلیفۂ وقت نے اپنے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی کو پیغامِ نکاح بھجوایا، لیکن انہوں نے کسی وجہ سے انکار کردیا اور اپنے حلقۂ درس کے ایک صالح اور پاک باز طالب علم ابن ابی وداعہ سے نکاح کرایا۔ حضرت نے دریافت فرمایا: تمہارے پاس کیا ہے مہر کے لیے؟ جواب دیا: ایک درہم کے سوا کچھ نہیں۔ فرمایا: میں نے اپنی بیٹی سے تمہارا نکاح ایک درہم کے عوض پڑھا دیا۔

ہمارے اسلاف کے ہاں شادی اتنی آسان تھی جس کے چند نمونے ذکر کیے گیے؛ لیکن ہم نے اسے اتنا مشکل کردیا ہے کہ بچیاں اور بچے عرصے تک کنوارے بیٹھے رہ جاتے ہیں، جس کے ذمے دار خود ہم ہیں اور ہمارا اپنا معاشرہ۔

ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ دنیا کا سب سے صالح، سعادت مند اور پاکیزہ معاشرہ وہی ہوگا جس معاشرے میں حلال کو آسان کیا گیا ہو اور حرام کو مشکل کیا گیا ہو، لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کے حقوق وواجبات بتاکر پاکیزہ رشتے سے منسلک کردیا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں فہم سلیم عطا فرمائیں۔

❊ ❊ ❊

۱۸/جمادی الاولی/۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینی غیرت اور عزتِ نفس

کبریائی اور بڑائی صرف خدائے ذوالجلال کو زیب دیتی ہے، حقیقی عظمت وبلندی کا مستحق صرف مالک کائنات ہے ''جس نے سب کچھ پیدا کیا اور ٹھیک ٹھیک بنایا، اور جس نے ہر چیز کو ایک خاص انداز دیا، پھر راستہ بتایا''۔[سورۂ اعلیٰ:۲-۳]

غرض تعریف تمام تر اللہ کی ہے جو سارے آسمانوں کا بھی مالک ہے، زمین کا بھی مالک ہے، اور تمام جہانوں کا بھی مالک ہے۔ اور تمام تر بڑائی اسی کو حاصل ہے، آسمانوں میں بھی، اور زمین میں بھی، اور وہی ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل ہے''۔[سورۂ جاثیۃ:۳۶-۳۷]

ایک ایمان والا صرف اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اور جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اسے رفعت دیتا ہے، کیوکہ مؤمن کو یہ معلوم ہے کہ تکبّر کرنا حرام ہے، جس شخص کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی کبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ متکبرانہ رویہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی رحمت اور اس کی ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں:

﴿ سَأَصۡرِفُ عَنۡ ءَايَٰتِيَ ٱلَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِ بِغَيۡرِ ٱلۡحَقِّ ﴾ [الأعراف: ١٤٦]

"میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں"۔[سورۂ اعراف:۱۴۶]

عزتِ نفس اور تکبر کے درمیان فرق

مسلمان تواضع ضرور اختیار کرتا ہے؛ لیکن ذلت کے ساتھ نہیں، خود کو حقیر بنانا، ذلیل کرنا اور اپنی کم زوری کا اظہار کرنا، اسلام پسند نہیں کرتا، بلکہ اسلام چاہتا ہے کہ ہر مسلمان، عزتِ نفس، خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ زندگی گزارے، اپنے دین، ایمان اور دین کی پاکیزہ تعلیمات پر اسے بھرپور فخر ہو۔ ایمان پر فخر محسوس کرنا ایک الگ شئے ہے جو مطلوب ہے، اور سرکشی والا کبر و غرور الگ شئے ہے، مال و متاع، جاہ و منصب، حسن و جمال اور قوت و طاقت کی بنا پر دوسروں کو حقیر سمجھنا اور خود کو برتر سمجھنا، یہ تکبر ہے جس کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں، اسلام اس کی سختی سے مذمت کرتا ہے؛ لیکن عزتِ نفس، خودداری، خود اعتمادی اور اپنے دین پر فخر و اعتزاز نہ صرف جائز ہے، بلکہ شرعاً مطلوب ہے۔ وہ خدا کی عظیم ذات پر ایمان رکھنے کی وجہ سے معزز ہے، وہ اس کریم ذات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مکرّم ہے۔

جب مؤذن روزانہ پانچ مرتبہ اپنی اذان کے شروع اور آخر میں اللہ کی کبریائی بیان کرتا ہے، اور جب نمازی اپنی نمازوں کے رکوع و سجود میں اپنے اعلیٰ و عظیم رب کی تسبیح بیان کرتا ہے، تو اس کے اندر یہ احساس جنم لیتا ہے کہ اگر کوئی حقیقی عظمت و رفعت والا ہے، تو وہ

صرف اللہ ہے، اس کے سوا اگر کوئی تکبر کرتا ہے تو وہ ایک ذلیل انسان ہے، اس کے علاوہ اگر کوئی اپنی عظمت کے گن گاتا ہے، تو وہ ایک حقیر انسان ہے جسے اپنی حقیقت اور اوقات معلوم نہیں۔

﴿ مَن كَانَ يُرِيدُ ٱلْعِزَّةَ فَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ جَمِيعًا ﴾ [فاطر: ۱۰]

"جو شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہو، تو تمام تر عزت اللہ کے قبضے میں ہے"۔[سورۂ فاطر:۱۰]

صرف اللہ کے ذات ہے جس کے سامنے ہم خود کو ذلیل کریں، اس کے سامنے اپنی پیشانی رگڑیں اور اسی سے اپنی فریاد کریں، کسی مخلوق کے سامنے خود کو ذلیل کرنا، اس سے فریاد کرنا اور اپنی شخصیت کو پامال کرنا صحیح نہیں ہے، ایک محتاجِ محض انسان، جو اللہ کی رحمت، عفو و درگزر، اس کے احسان و کرم اور اس کی نظر عنایت کا ہر وقت محتاج ہے، وہ دوسرے کی کیا دادرسی کر سکے گا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اسی نہج پر ڈالا تھا، اور اسی طرح ان کی تربیت کی تھی، یہاں تک کہ ان میں سے کوئی گھوڑے پر سوار ہوتا اور اس کا کوڑا زمین پر گر جاتا تو کسی سے سوال نہیں کرتا کہ اٹھا کر دے دو، بلکہ خود سواری سے اتر کر اٹھاتا، پھر دوبارہ سوار ہو جاتا۔ ان پر ایسے حالات بھی آئے کہ رات دن میں صرف ایک کھجور پر گزارہ کرنا پڑا، بلکہ بعض دفعہ درخت کے پتے کھانے پڑے؛ لیکن خودداری اور عزتِ نفس کا یہ حال تھا کہ کسی کے سامنے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ بقول علامہ اقبالؒ کے:

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

ایمانی غیرت اور عزّتِ نفس کی ایک اعلیٰ ترین مثال

غزوۂ احزاب جسے غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے، جو سن ۵ ہجری میں پیش آیا تھا، اس غزوے کے لیے بڑی خندق کھودی گئی تھی، صحابۂ کرامؓ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ بھی بذاتِ خود عمل میں شریک تھے، اس غزوے میں مسلمان مجاہدین کی تعداد محض تین ہزار تھی، جب کہ دشمنوں کی تعداد دس سے بارہ ہزار تک تھی، بنو قریظہ نے حضور ﷺ سے جنگ بندی کا معاہدہ کیا تھا؛ لیکن انہوں نے بھی معاہدہ توڑ دیا اور مکے سے آئے ہوئے دشمنوں کے ساتھ مل گئے، مجاہدین کے لیے نہایت سخت آزما اور مشکل ترین وقت تھا، کیوں کہ ہر طرف سے دشمنوں کی یلغار شروع ہوگئی، اس نازک گھڑی کا وصف قرآنِ کریم نے یوں بیان کیا ہے:

﴿ إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ ٱلْأَبْصَـٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلْقُلُوبُ ٱلْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِٱللَّهِ ٱلظُّنُونَا۠ ﴿١٠﴾ ﴾

[الأحزاب: ١٠]

”یاد کرو جب وہ (دشمن) تم پر تمہارے اوپر سے بھی چڑھ آئے تھے اور تمہارے پیچھے سے بھی، اور جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آگئے تھے، اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچنے لگے تھے“۔

[سورۂ احزاب: ۱۰]

طرح طرح کی سوچ، کمزور ایمان والوں اور منافقین کے ذہن میں آنے لگی تھی، لیکن جو پکے ایمان والے تھے، انہیں یقین تھا کہ یہ وقتی آزمائش ہے جو بالآخر ٹل جائے گی،

اسی کو قرآن نے کہا:

﴿ هُنَالِكَ ٱبْتُلِىَ ٱلْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا۟ زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴿١١﴾ ﴾

[الأحزاب: ١١]

”اس موقع پر ایمان والوں کی بڑی آزمائش ہوئی اور وہ جھنجھوڑ دیے گئے“۔

[سورۂ احزاب:۱۱]

جب رسول اللہ ﷺ نے صورتِ حال کی سنگینی دیکھی اور مجاہدین کی پریشانی اور سخت اور دیر طلب مقابلے کی وجہ سے ان کی نازک حالت دیکھی تو آپؐ نے قریش کے دو قائدین: عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف کے پاس صلح کا پیغام بھیجا، اور یہ صلح کی پیش کش آپ نے انسانی جانوں کی اور عزت وآبرو کی حفاظت کے پیش نظر کی تھی، آپؐ نے ان سے یہ طے فرمایا کہ ہم تمہیں مدینہ منورہ کے پھلوں کا ایک تہائی حصہ دے دیا کریں گے اور تم اپنی قوم کو لے کر واپس چلے جاؤ، چناں چہ وہ راضی ہوگئے اور وثیقۂ صلح تیار بھی ہوگیا؛ لیکن ابھی اس پر گواہ مقرر نہیں کیے گیے تھے نہ ہی دستخط ہوے تھے۔

دستخط کرنے سے قبل آپؐ نے حضرت سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کو بلا کر اس صلح کا ذکر کیا اور اس سلسلے میں ان کا اپنا مشورہ طلب فرمایا، یہ حکمتِ عملی رسول اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک پر اللہ تعالیٰ نے القاء فرمائی تھی، تاکہ ان حضرات کی ایمانی قوت وعزیمت کا معیار معلوم ہوجائے، چناں چہ یہ سن کر ان دونوں حضرات نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ صلح آپ اپنی پسند سے کر رہے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے، یا ہماری رعایت میں آپؐ اسے انجام دے رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”بلکہ یہ تمہاری رعایت میں کر رہا ہوں، قسم ہے اللہ کی، میں یہ صرف اس وجہ سے کر رہا ہوں کہ میں نے دیکھا کہ سارے

عرب نے مل کر تم پر ایک تیر سے وار کیا ہے اور ہر طرف سے تمہارے اوپر چڑھائی کی ہے، لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ کسی طرح بھی ان کے (وقتی) تسلط کو ختم کروں۔ یہ سن کر حضرت سعد بن معاذ نے کہا: جس وقت ہم اور یہ لوگ شرک میں مبتلا تھے، ہم بتوں کو پوجتے تھے، اللہ کو جانتے تھے نہ اس کی عبادت کرتے تھے، اس وقت ان کی جرءت نہیں تھی کہ ہم سے ایک کھجور بھی لے سکیں، سوائے خرید و فروخت کے یا مہمان نوازی کے، تو اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی عظیم دولت سے سرفراز کیا ہے، ہدایت کی روشنی عطا کی ہے اور ہمیں آپ کے ذریعہ اور اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے، تو ہم اپنا مال انہیں دیں گے؟ خدا کی قسم ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، قسم ہے اللہ کی، ان کے لیے ہمارے پاس تلوار کے علاوہ کچھ نہیں، یہاں تک کہ اللہ ہی ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ ایمان و یقین سے لبریز ان کا یہ جواب سن کر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "جیسی تمہاری مرضی ہو"۔ پھر حضرت سعد بن معاذؓ نے معاہدے کا وثیقہ لے کر اس میں جو کچھ لکھا تھا اسے مٹا دیا اور کہا: "اب وہ ہم پر حملہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں"۔

اب مقابلے کا وقت آگیا، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور مجاہدینِ اسلام ایک طرف اور دشمنانِ اسلام دوسری طرف آمنے سامنے کھڑے ہوگئے، مشرکینِ قریش کے گھوڑے حرکت میں آگئے، ان کے شہ سوار جب خندق کے پاس پہنچے تو دیکھ کر کہنے لگے: "ان لوگوں نے ایسی چال چلی ہے جس سے عرب ناواقف تھے"۔ پھر شیرِ خدا حضرت علیؓ چند ساتھیوں کے ہم راہ میدان میں اتر گئے، ان کے روبرو قریش کا پہلوان عمرو بن ودّ تھا۔ حضرت علیؓ نے پہلے اسے اسلام کی دعوت دی، لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر حضرت علیؓ نے مقابلے کی دعوت دی، تو کہنے لگا: "بھتیجے! ایسا کیوں

کررہے ہو؟ میں تمھیں قتل کرنا نہیں چاہتا" یہ سن کر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ لیکن میں تو چاہتا ہوں کہ تمھیں قتل کروں۔ یہ سننا تھا کہ وہ آگ بگولہ ہوگیا، اپنے گھوڑے سے اترا، گھوڑے کو ذبح کردیا تاکہ بھاگنے کا خیال نہ آئے، اس کے بعد حضرت علی کو للکارا، دونوں طرف سے تلواریں چلنے لگیں، چند لمحوں میں حضرت علیؓ نے اس کا سر، تن سے جدا کردیا اور ہر طرف سے مسلمانوں کی تکبیر کی آوازیں آنے لگیں، چوں کہ مشرکین کا سب سے بڑا بہادر پہلوان مارا گیا، اس لیے ان کے پیر اکھڑ گئے، جنگ کا پانسا پلٹ گیا، موسم کی ناخوش گواری نے ان کے پیروں کے ساتھ ساتھ ان کے خیمے بھی اکھاڑ دیے، بالآخر مسلمان فتح یاب ہوے اور مشرکین شکست کھاکر بھاگ گئے:

﴿وَرَدَّ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُواْ خَيْرًا ۚ وَكَفَى ٱللَّهُ ٱلْمُؤْمِنِينَ ٱلْقِتَالَ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ﴿٢٥﴾﴾ [الأحزاب: ٢٥]

"اور جو لوگ کافر تھے، اللہ نے انھیں ان کے سارے غیظ وغضب کے ساتھ اس طرح پسپا کردیا کہ وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکے۔ اور مومنوں کی طرف سے لڑائی کے لیے اللہ خود کافی ہوگیا۔ اور اللہ بڑی قوت کا، بڑے اقتدار کا مالک ہے"۔ [سورۂ احزاب:۲۵]

شروع میں مسلمان اس قدر پریشان تھے کہ کلیجے منہ کو آرہے تھے، دشمنوں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی، مسلمان صرف تین ہزار تھے، حتی کہ حضور ﷺ مدینے کی کھجوروں کا ایک تہائی دے کر صلح پر آمادہ ہوگئے تھے، لیکن مشورے کی برکت سے اللہ نے سعد بن معاذؓ سے ایسی حوصلہ بخش بات کہلوائی کہ حضور ﷺ بھی خوش ہوے اور بالآخر حیرت انگیز فتح ونصرت نصیب ہوئی، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ تاریخی جملہ

ارشاد فرمایا:

«اَلْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا». [صحيح البخاری]

"اب ہم ان پر حملہ کریں گے، وہ ہم سے لڑنے کے لیے نہیں آسکیں گے"۔[بخاری شریف]

چناں چہ یہی ہوا، دوبارہ قریش کی حملے کی ہمت نہیں ہوئی، بلکہ حضور ﷺ نے ہی حملہ کیا اور آخر کار مکہ مکرمہ بھی فتح ہوا اور اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا کیا، مسلمانوں کو عزت دی۔

﴿وَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝٨﴾ [المنافقون: ۸]

"اور عزت تو اللہ ہی کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے، لیکن یہ منافق نہیں جانتے"۔[سورۂ منافقون:۸]

جس دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت و عظمت ہوگی، جو دل، اسلام کے ابدی پیغام کو برحق سمجھتا ہوگا، اسلام ہی کو ساری انسانیت کے لیے راہِ نجات سمجھتا ہوگا، اسلام کے بغیر دنیا اور آخرت کی ناکامی اور خسارہ تصور کرتا ہوگا، وہی شخص عقیدۂ توحید پر، عقیدۂ رسالت پر، عقیدۂ حشر و نشر پر اور عقیدۂ آخرت پر اور تمام اسلامی شعائر پر فخر محسوس کرے گا، اسے اسلامی عادات واطوار پر، اسلامی طرزِ زندگی پر، اسلامی اخوت و مودّت پر، شرعی لباس و پوشاک پر، فرائض وواجبات پر اور حضور ﷺ کی ہر سنت پر بے پناہ فخر ہوگا، اسی میں اپنی اور پوری کائنات کی سعادت مندی اور خوش بختی کا یقین ہوگا، وہ کبھی بھی اس کھوکھلی تہذیب و تمدن کو للچائی نگاہوں سے نہیں دیکھے گا جو اسلامی تہذیب

و تمدن سے متصادم ہو، بلکہ انہیں دیکھ کر پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ وہی پیغمبرانہ الفاظ کہے گا جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہے تھے:

﴿فَمَآ ءَاتَىٰنِۦَ ٱللَّهُ خَيۡرٞ مِّمَّآ ءَاتَىٰكُم﴾ [النمل: ٣٦]

”اللہ نے مجھے جو کچھ دیا ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تمہیں دیا ہے“۔

[سورۂ نمل:۲۷]

احساسِ کمتری اور مایوسی کے اسباب

احساس کمتری کے متعدّد اسباب ہیں، اگر آپ کو اپنے مذہب، اپنے شعائر اور اپنی اسلامی تہذیب پر فخر نہیں ہے، بلکہ آپ دوسروں کی تہذیب کو زیادہ قابل ستائش اور لائق تقلید سمجھتے ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ آپ احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔

بنیادی طور پر ایمان ویقین کی کمزوری کی وجہ سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے، اس لیے اگر کوئی احساسِ کمتری میں مبتلا ہے تو اسے ایمان ویقین کی محنت میں لگنا چاہیے، ان اہل اللہ سے رابطہ قائم کرنا چاہیے جن کی مجلسوں میں بیٹھ کر ایمان ویقین تازہ ہوتا ہے، جن کی صحبت میں رہ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے — اسی طرح قرآنِ کریم کی کثرت سے تلاوت کرے، اس کی آیتوں میں تدبر کرے، عربی نہ جانتا ہو تو اپنی زبان میں اس کے ترجمے اور تفسیر پڑھے، نیز احادیث پاک کا مطالعہ کرے، اگر وقت نہ ہو تو کم از کم معتبر اہل علم کی تقریریں سنے اور صالحین کی صحبت اختیار کرے۔

جب یقینِ محکم دل میں موجزن ہو جائے گا، تو نہ صرف احساسِ کمتری ختم ہو گا بلکہ حوصلہ ملے گا، خود اعتمادی پیدا ہو گی، اور پھر اعمال صالحہ کے انجام دینے میں لذت

وحلاوت محسوس ہوگی۔ بقول علامہ اقبال کے:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

بعض دفعہ معاشی تنگ حالی کی وجہ سے انسان احساسِ کمتری کا شکار ہوجاتا ہے، کبھی کبھی اپنی عزتِ نفس کو پامال کرکے اس کی خاطر نفس کو ذلیل کربیٹھتا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ مال ودولت کی کثرت وقلت معیارِ عزت وذلت نہیں ہے، بلکہ معیارِ عزت وذلت تقویٰ اور معصیت ہے۔ اگر آپ اطاعت شعار ہیں، پاک باز اور متقی ہیں، تو آپ معزز ہیں، لیکن اگر گناہوں میں لت پت ہیں، توبہ کے بغیر ہی زندگی کے قیمتی لمحات یوں ہی گزار رہے ہیں، تو بلاشبہ یہ باعثِ ذلت وخواری ہے۔ اسی لیے یہ دعا منقول:

«اللّٰهُمَّ أَعِزَّنِيْ بِطَاعَتِكَ، ولَا تذلَّنِيْ بِمَعْصِيَتِكَ».

"اے اللہ! مجھے اپنی طاعت کی توفیق دے کر عزت عطا فرما، اور اپنی معصیت کی وجہ سے مجھے ذلیل نہ فرما"۔

مزید یہ کہ آخر رزق میں زیادہ کشادگی نہ ہونے کی وجہ سے انسان خود کو ذلیل کیوں کرے، جب کہ رزّاق اللہ ہے، دینے والا وہی ہے، ہمیں اسباب اختیار کرنے کا مکلف بنایا ہے، ہمارے نصیب کی روزی ہمیں مل کر رہے گی، ہمارا حصہ کوئی دوسرا لے ہی نہیں سکتا۔

"کوئی ذی روح اس وقت تک مر نہیں سکتا جب تک کہ اپنے مقدر کی روزی حاصل نہ کرلے"۔

جب یہ بات ہے تو پھر اللہ کی معصیت کے ذریعے اسے کیوں حاصل کیا جائے۔

فقر وفاقے کا خوف، یا اپنی جان کا خوف بھی انسان کو کبھی کبھی ذلیل کر دیتا ہے، خوف کی وجہ سے دوسروں سے امیدیں وابستہ کر کے ان کے سامنے خود کو ذلیل ورسوا کرتا ہے، حالاں کہ اگر اللہ نہ چاہے تو کوئی بھی تمہیں نفع نہیں پہنچا سکتا، اسی طرح اگر لوگ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو اللہ کی مرضی کے بغیر ہرگز نہیں پہنچا سکتے، ارشاد نبوی ہے:

«وَاعْلَمْ أَنَّ الأُمَّةَ لَوْ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ، لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لَكَ، وَلَوْ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ، لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ». [رواه الترمذي]

”اور تم جان لو کہ پوری امت مل کر اگر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے، تو اس سے زیادہ نفع نہیں پہنچا سکتی جتنا اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ اور اگر وہ سارے کے سارے تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائیں تو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جو اللہ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے، قلم اٹھ چکے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں“۔ [ترمذی شریف]

خلاصۂ گفتگو

جس قدر انسان کا دل اللہ کی محبت اور تقویٰ شعاری سے سرشار ہوگا، اسی کے بقدر اس کے اندر خود اعتمادی، خودداری اور دوسروں سے بے نیازی پیدا ہوگی۔ دوسروں کے سامنے تواضع وانکساری وخاک ساری کے ساتھ پیش آئیں، اپنے حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کریں، دوسروں کے کام آئیں، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کو اپنی سعادت سمجھیں؛ لیکن یہ

سب کچھ عزتِ نفس کے ساتھ کریں، اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر نہ کریں، بلکہ رضائے الٰہی کے لیے کریں، سرفرازی کے ساتھ کریں، کسی لالچ یا دنیوی مقصد کے لیے نہ کریں، استغنا اور عزتِ نفس کے ساتھ کریں۔

مسلمان کے تقویٰ کا معیار جتنا بلند ہوجائے گا، خودداری بڑھتی جائے گی، دل، خدا کی عظمت وکبریائی سے معمور ہوتا جائے گا، دنیا کی بے وقعتی دل میں بیٹھتی جائے گی اور آخرت کی اہمیت اور اس کی فکر میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، پھر دوسروں کے سامنے اسلام اور اس کی تعلیمات کو معذرت خواہانہ انداز میں نہیں پیش کرے گا، بلکہ پورے اعتماد وافتخار کے ساتھ اس پر عمل بھی کرے گا اور دوسروں کو اس کی ترغیب بھی دے گا۔

نسأ اللهَ تعالى أن يكرمنا بطاعته، ويعزّنا بعبادته، ولا يذلّنا بمعصيته، كما نسأله تعالى أن يرفعنا بالإسلام والقرآن العظيم ويحفظنا من الشيطان الرجيم.

* * *

۱۴۳۱/۳/۱۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زاہدانہ زندگی اور فکرِ آخرت

دینِ اسلام، فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو حلال اور منظم طور پر پورا کرتا ہے، اسلام میں رہبانیت (Monasticism) نہیں ہے، بلکہ اسلام، رہبانیت کے خلاف ہے، یہاں دین بھی ہے اور دنیا بھی، اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا اور آخرت، دونوں کی بھلائی طلب کرنے کا حکم دیا ہے، اسلام ہمیں دنیا میں باعزت زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے اور آخرت کی سرخ روئی اور کامیابی کو اولویت دیتا ہے؛ لیکن یہ ہمیشہ یاد رہے کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا صحیح نہیں ہے، اسی طرح دنیا اور متاعِ دنیا میں رات دن اس قدر مست ہوجائے کہ آخرت کو فراموش کرجائے، یا دنیا سے ایسی دل بستگی ہوجائے کہ زہد وقناعت اور آخرت سے متعلق گفتگو کو ناپسند کرنے لگے، دنیاوی عیش وعشرت میں اس طرح پھنس جائے کہ زاہدانہ زندگی کو معیوب سمجھنے لگے، اس سوچ اور فکر کو اسلام ناپسند کرتا ہے۔

رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سید الزاہدین والعابدین تھے، دنیاوی متاع سے آپؐ نے فائدہ اٹھایا اور صحابۂ کرامؓ نے بھی فائدہ اٹھایا؛ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ماہ یا دو ماہ گزر جاتے اور آپؐ کے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا، آپؐ اور آپ کے اہل خانہ صرف ”اسودین“ یعنی

کھجور اور پانی پر گزر بسر کرتے تھے۔

دنیاوی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے

اللہ تعالیٰ نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دنیاوی زیب و زینت اور اس کے پر فریب نظاروں میں الجھ کر اصل مقصد کو بھول جائیں۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّ وَعۡدَ ٱللَّهِ حَقٌّۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلۡحَيَوٰةُ ٱلدُّنۡيَاۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِٱللَّهِ ٱلۡغَرُورُ ٥ ﴾ [فاطر: ۵]

"اے لوگو! یقین جانو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، لہٰذا تمہیں یہ دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے، اور نہ اللہ کے معاملے میں تمہیں وہ (شیطان) دھوکے میں ڈالنے پائے، جو بڑا دھوکے باز ہے"۔ [سورۂ فاطر:۵]

رسول اللہ ﷺ نے اس دنیا کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"اگر اس دنیا کی قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دیتا"۔ [ترمذی شریف]

یہ بھی فرمایا کہ:

«الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ». "یعنی یہ دنیا ایمان والے کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ [مسلم شریف]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے دونوں کاندھوں کو پکڑ کر فرمایا:

«كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»

"تم دنیا میں ایسے رہو جیسے تم کوئی اجنبی ہو یا رہ گزر مسافر"

اسی لیے حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے:

«إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ، ومن حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ».

[صحيح البخاري]

"جب تمہاری شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب صبح ہو تو شام کا انتظار نہ کرو (یعنی امید نہ رکھو) اور اپنی صحت سے بیماری کے لیے اور زندگی سے موت کے لیے توشہ لے لو"۔ [بخاری شریف]

حضرت ابوذرؓ (جُندُب بن جُنادة) کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے علاقۂ "حرّة" میں ایک روز میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا، یہاں تک کہ جبل احد ہمارے سامنے آگیا، اس وقت حضور ﷺ نے «يا أباذر»! کہہ کے مجھے مخاطب فرمایا، تو میں نے کہا: لبیک یا رسول اللہ! پھر آپؐ نے فرمایا:

"مجھے یہ پسند نہیں کہ احد پہاڑ کے برابر میرے پاس سونا ہو، پھر تین روز گزر جائیں اور ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، سوائے اس کے کہ اس میں سے کچھ قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ چھوڑوں، البتہ میں اسے اللہ کے بندوں میں اس طرح خرچ کروں: دائیں سے بائیں سے اور پیچھے سے..." [متفق علیہ]

زہد وقناعت اور شکر گزاری کا راز

اگر کوئی شخص زہد وقناعت کی زندگی گزارنا چاہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے

تئیں شکر وامتنان کے جذبات اپنے دل میں پیدا کرنا چاہے، تو اس کے لیے اسلامی اصول یہ ہے کہ دنیاوی امور میں اپنے سے کم تر درجے کے لوگوں کو دیکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«انْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ». [مسلم]

”تم ان کو دیکھو جو تم سے (دنیاوی امور میں) کم تر ہوں، اور ان کی طرف نہ دیکھو جو تم سے برتر ہوں، یہ لائق تر ہے کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو“۔

[مسلم شریف]

اگر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ مال و دولت اور حسن و جمال وغیرہ میں آپ سے فائق انسان پر نظر پڑے، تو اسی وقت اس کے برعکس پہلو پر بھی نظر ڈالو، اس سے ناشکری اور کینہ وحسد اور ذہنی الجھن و پریشانی کے بہ جائے شکر گزاری اور سکون واطمینان کی کیفیات دل میں پیدا ہوں گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلَى مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي المَالِ وَالخَلْقِ، فَلْيَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ». [صحيح البخاري]

”جب تم میں کا کوئی شخص ایسے شخص کو دیکھے جو مال اور حسن و جمال میں اس سے برتر ہو، تو اسے ایسے شخص کو دیکھنا چاہیے جو اس سے کم تر ہو“۔

[بخاری شریف]

لیکن جب معاشرے میں مادہ پرستی کا دور دورہ ہو، ہر ایک صرف مادہ اور مَعِدہ کی ہی فکر میں لگا ہوا ہو، اسی میں تنافس اور تفاخر ہو رہا ہو، یہی معیارِ عزت وشرافت بن

جائے، تو ہر ایک کی نظر صرف اپنے سے اوپر والے کی طرف ہوگی، نیچے والے کی طرف نگاہ جائے گی ہی نہیں، نتیجہ یہ نکلے گا کہ غفلت، خدافراموشی اور ناشکری کے جذبات دلوں میں پیدا ہوں گے۔

صحابۂ کرامؓ کی زاہدانہ زندگی

حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عیش پسندانہ زندگی سے نہ صرف دور رہتے تھے؛ بلکہ دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین کرتے تھے، دنیاوی عیش وعشرت کو دیکھ کر انہیں یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی قربانیوں کا صلہ انہیں دنیا میں دے کر آخرت کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہو۔

صحیحین میں حضرت خبّاب بن الارتؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا صلہ ہمیں دے دیا، لیکن ہم میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنا دنیاوی صلہ لیے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ان ہی میں سے مصعب بن عمیرؓ بھی ہیں، جو غزوۂ احد کے موقع سے شہید ہو گئے اور اپنی صرف ایک چادر چھوڑ گئے، جب ہم ان کا سر اس سے ڈھکتے تھے تو پاؤں کھل جاتا تھا، اور جب پاؤں ڈھکتے تھے تو سر کھل جاتا تھا، پھر رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ سر کو ڈھک دیں اور پاؤں پہ درخت کے پتے رکھ دیں۔ یہ وہ نوجوان صحابی تھے جو مکہ مکرمہ کے مال دار ترین لوگوں میں تھے، حسن وجمال کا پیکر اور خوش بوؤں کے دلدادہ تھے، عیش وعشرت اور رفاہیت کی زندگی گزاری تھی۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ:

”میں نے ستر اصحابِ صفہ کو دیکھا کہ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس چادر ہو، یا تو صرف تہہ بند ہوتی، یا رات کو اوڑھنے کا کپڑا جسے یہ لوگ اپنی گردنوں سے باندھ لیتے۔ یہ کپڑے کسی کی آدھی پنڈلی تک پہنچتے، کسی کے ٹخنوں تک۔ وہ اپنے کپڑوں کو ہاتھوں سے سمیٹتے رہتے تھے، تاکہ شرم گاہ نہ کھل جائے“۔[بخاری شریف]

حضرت ابوالدرداءؓ نے جب اسلام قبول کیا، تو پوری طرح اللہ کے ہو رہے، جینا مرنا سب اللہ کی خاطر ہو گیا، کہتے تھے: میں نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حرام کیا ہے، میں ان لوگوں میں اپنا شمار چاہتا ہوں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَـٰرَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ ٱللَّهِ﴾ [النور: ۳۷]

”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی تجارت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی“۔

چناں چہ انہوں نے دنیاوی زیب وزینت اور اس کی عیش وعشرت کو خیر باد کہہ دیا اور فقط اتنی مقدار میں خشک خوراک پر اکتفا کیا جس سے کمر سیدھی رکھ سکیں، اور اتنے معمولی سے کپڑے پر گزارا کیا جتنے سے اپنا جسم چھپا سکیں۔

حضرت ابوالدرداءؓ کی زاہدانہ زندگی کی ایک جھلک

حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت ابوالدرداءؓ کو امام اور معلّم بنا کر دمشق بھیجا، جب وہ ملک شام کے شہر دمشق پہنچے تو دیکھا کہ لوگ دنیا اور اس کے رنگ برنگ کے نقشوں اور عشرت کدوں میں اس قدر منہمک ہیں کہ آخرت کی تیاری کی انہیں فرصت ہی نہیں، چناں چہ انہوں نے سب کو جمع کیا اور ان کے سامنے وعظ ونصیحت

کے بلیغ کلمات پیش کیے:

”لوگو! آپ ہمارے دینی بھائی ہیں، ہم سایے ہیں اور دشمنوں کے خلاف معین ومددگار ہیں۔ دمشق والو! آپ کو میری دوستی اور قبولِ نصیحت سے کیا چیز مانع ہے؟ حالاں کہ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے، میری نصیحت آپ کے لیے ہے، جب کہ میرا نان ونفقہ کسی اور پہ ہے۔ کیا بات ہے کہ جس چیز کی ذمہ داری اللہ نے خود لے رکھی ہے، اس کے لیے تم اپنی ساری صلاحیتیں صرف کررہے ہو اور جس کا حکم دیا ہے اس کو تم نے چھوڑ رکھا ہے؟ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم اتنا جمع کر لیتے ہو جسے کھا نہیں پاتے، اتنی عمارتیں بناتے ہو، جن میں تم رہ نہیں پاتے، اتنی لمبی لمبی آرزوئیں کرتے ہو جو پوری نہیں ہوتیں؟ تم سے پہلے کی قوموں نے بھی خوب جمع کیا اور خوب امیدیں باندھیں؛ لیکن کچھ ہی دن گزرے کہ ان کی جمع پونجی برباد ہوگئی، ان کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور ان کے مکانات ان کی قبروں میں تبدیل ہوگئے۔ اے دمشق والو! یہ ہے قوم عاد، جنہوں نے روئے زمین کو مال واولاد سے بھر دیا تھا، لیکن کوئی ہے جو ان کے ترکے کو آج دو درہم میں بھی خرید لے“۔

جن دنوں وہ دمشق میں تھے، حضرت عمر بن الخطابؓ نے احوال کا جائزہ لینے کے لیے شام کا سفر کیا، چناں چہ رات کے وقت اپنے ساتھی ابوالدرداءؓ کی زیارت کے لیے پہنچے، جب دروازے پہ دستک دی تو دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا، اندر سے بند نہیں تھا، بغیر کسی چراغ کے اندھیرے گھر میں داخل ہوے، جب حضرت ابوالدرداءؓ نے یہ محسوس کیا کہ حضرت امیر المؤمنین تشریف لائے ہیں، تو کھڑے ہو کر ان کا پر تپاک استقبال کیا اور بٹھایا، بیٹھ کر

گفتگو کرنے لگے، حالاں کہ رات کی تاریکی انہیں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے میں آڑے آرہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان کے تکیے پر اپنا ہاتھ رکھا تو محسوس ہوا کہ یہ وہ ٹاٹ ہے جو جانور کی پشت پر رکھا جاتا ہے، جب ان کے بستر کو ٹٹولا تو وہ کنکریاں تھیں۔

جب ان کے جسم کے کپڑے پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ وہ معمولی سا پتلا کپڑا ہے جو دمشق کی سردی کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر حضرت عمرؓ سے رہا نہ گیا، حضرت ابوالدرداءؓ کی طرف متوجہ ہوے اور فرمایا:

"اللہ تمہارے اوپر رحم کرے، کیا میں نے کوئی کمی کر رکھی ہے؟ کیا میں نے تمہارے پاس ضرورت کی چیزیں نہیں بھیجی ہیں؟" یہ سن کر حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت عمر سے کہا: "عمر! کیا تمہیں وہ حدیث یاد ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنایا تھا؟ کہا: وہ کیا ہے؟ ابوالدرداءؓ نے کہا: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا:

«لِيَكُنْ بَلَاغُ أَحَدِكُمْ مِنَ الدُّنْيَا كَزَادِ الرَّاكِبِ» یعنی تمہارا سامانِ دنیا، ایک مسافر کے توشے کی طرح ہونا چاہیے"۔

حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں، بالکل فرمایا تھا۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے کہا: پھر تم ہی بتاؤ عمر! حضور ﷺ کے بعد ہم نے کیا کیا؟ پھر دونوں حضرات رونے لگے، یہاں تک کہ روتے روتے صبح کر دی"۔ [رواہ الحاکم]

حضرت ابوالدرداءؓ نے اس طرح زاہدانہ زندگی بسر کی تھی؛ لیکن اس کے باوجود خوفِ خدا کا یہ حال تھا کہ جب ان کا آخری وقت آیا، بسترِ مرگ پر تھے، تو ان کے چند احباب ان کی عیادت کو آئے اور کہا: آپ کو کیا تکلیف ہے؟ تو فرمایا کہ اپنے گناہوں کی۔ پھر

پوچھا: آپ کی خواہش کیا ہے؟ کہا کہ خواہش یہ ہے کہ میرا رب مجھے معاف کردے۔ اس کے بعد جوان کے اردگرد بیٹھے تھے ان سے کہا: مجھے کلمہ کی تلقین کرو، چناں چہ کلمہ پڑھتے رہے اور اسی حال میں اپنے رب سے جاملے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَأَرْضَاهُ وَعَنِ الصَّحَابَةِ أَجْمَعِيْنَ-

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کی مبارک زندگیاں، ترجمان تھیں رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کی جن میں آپؐ نے آخرت کی ترغیب دی ہے اور دنیا کی بے ثباتی کو بیان فرمایا ہے۔ آپؐ ایک مرتبہ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے جس کے نشانات آپؐ کے خوب صورت اور مبارک جسم اطہر پہ پڑگئے تھے، یہ دیکھ کر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے لیے بستر کا انتظام کر دیا جائے، یہ سن کر آپؐ نے فرمایا:

«مَا لِي وَلِلدُّنْيَا، مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا». [رواه الترمذي]

”مجھے دنیا سے کیا سروکار ہے، دنیا سے میرا تعلق ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسافر ہو، جو کسی درخت کے سایے میں بیٹھا ہو، پھر اسے چھوڑ کر چلا جائے“۔

[ترمذی شریف]

متَّفق علیہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا شَاعِرٌ، كَلِمَةُ لَبِيدٍ:

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ

”سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہے وہ لبید کا قول ہے: سن لو! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے“۔

خالق اور مخلوق کی محبت کا راز

ایک صحابی حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ!

«دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا أَنَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِي اللهُ وَأَحَبَّنِي النَّاسُ».

"اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتادیجیے کہ جب میں اسے انجام دوں تو اللہ مجھ سے محبت فرمائیں اور لوگ بھی محبت کریں"۔

ان کے اس سوال کے جواب میں سرورِ عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللهُ، وَازْهَدْ فِيمَا فِي أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ». [ابن ماجه]

"دنیا کی رغبت دل سے نکال دو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہوجاؤ، وہ تم سے محبت کریں گے"۔[ابن ماجہ]

دنیا کے فتنے سے بچو

اسلام نے دنیا کو ناپاک نہیں کہا، نہ ہی اس کے حاصل کرنے سے منع کیا ہے، البتہ اس میں منہمک ہوکر آخرت کو فراموش کرنے سے منع کیا ہے، بالکل اسی طرح جیسے عورتوں کو اسلام نے عزت ومقام دیا، ان کی تکریم کی ہے، مردوں کو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا، لیکن ان کے فتنے سے بچنے کی تاکید کی ہے؛ تاکہ ناجائز تعلقات کی وجہ سے گناہوں میں مبتلا ہوکر اپنی آخرت برباد نہ کرلیں، اسی تناظر میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ فرمان پڑھیے:

«إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَإِنَّ اللهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ، فَاتَّقُوا الدُّنْيَا، وَاتَّقُوا النِّسَاءَ فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ». [رواہ مسلم]

”بے شک دنیا، شیریں اور سرسبز ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں تم سے پہلے والوں کا جانشین بنائے گا، تاکہ یہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ لہٰذا تم دنیا (میں شدید انہماک) سے بچو، اور عورتوں (کے فتنے) سے بچ کر رہنا، کیوں کہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں ہی کے حوالے سے پیش آیا تھا“۔

[مسلم شریف]

مال کا نام مال اس لیے رکھا گیا ہے کہ انسان کے دل کا میلان اس کی طرف ہوتا ہے، اس کی کشش اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، لہٰذا یہ فطری بات ہے کہ مال کی محبت دل میں آئے؛ لہٰذا اگر بندہ حلال ذرائع سے کمائے اور حلال مصارف میں خرچ کرے تو اس میں کوئی عیب کی بات نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کے برعکس ہو تو پھر یہ فتنہ ہے۔

(اس کے حلال میں حساب ہے، اس کے حرام میں عقاب ہے، اس کا انجام نہایت خراب ہے، اس میں ضرورت سے زیادہ وہی منہمک ہوتا ہے جو عقلِ سلیم کھو بیٹھا ہو، جو یہاں سے چلا جاتا ہے، وہ کبھی واپس نہیں آتا، سارے پیارے اپنے احباب کو چھوڑ کر چلے گئے، اپنے اعزہ واقارب سے جدا ہوگئے اور اب اپنے انجام کے انتظار میں ہوں گے: حسنِ عمل پر ثواب ملے گا اور سوءِ عمل پر عقاب یعنی سزا —— دنیا سے آخرت کے اس سفر میں تسلسل ہے، یہ سفر جاری ہے، تھمنے کا نام نہیں لیتا، لوگ انفرادی اور اجتماعی شکل میں کوچ کر رہے ہیں: خواہ وہ ماں باپ ہوں، مال دار وفقیر ہوں، بادشاہ ورعایا ہوں، نیکوکار یا

بدکار ہوں، ایمان والے یا کفار ہوں، سب کے سب اس سفر پر گامزن ہیں)۔

حضرت محمد بن واسع الازدیؒ اور ہیرے جواہرات سے مُرصّع تاج

جلیل القدر تابعی محمد بن واسعؒ ایک معرکے میں مسلم فوج کے ہم راہ تھے، اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی، اس قدر مالِ غنیمت ان کے حصے میں آیا کہ اس کا شمار مشکل ہو گیا، اسی میں ایک نہایت قیمتی تاج بھی تھا جو سونے اور ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا تھا، اس پر دل کش نقش و نگار اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگا رہے تھے، ہر ایک کی گردن اس کی طرف اٹھ رہی تھی اور ان کی نگاہیں اس پر ٹکی ہوئی تھیں —— اس لشکر کے امیر یزید بن المہلّب نے اسے اوپر اٹھا کر سب کے سامنے کیا، تاکہ سب دیکھ لیں، پھر کہا: تمہارا کیا خیال ہے، کیا کوئی ایسا شخص بھی ہو گا جو اس تاج سے اپنی بے نیازی ظاہر کرے اور لینے سے انکار کرے؟ لوگوں نے کہا: -اللہ تعالیٰ امیر کا بھلا کریں- ایسا کون ہو گا جو اس سے اپنی نظریں پھیرے، امیر نے کہا کہ تم دیکھو گے کہ امتِ محمدیہ میں ابھی بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو نہ صرف اس تاج سے، بلکہ اس طرح کے تاج سے پوری زمین بھر جائے اس سے بھی بے رغبت اور بے نیاز ہیں۔ پھر اپنے دربان سے کہا: جاؤ، محمد بن واسع الازدی کو تلاش کر کے لے آؤ، چناں چہ وہ ان کی تلاش میں نکل گیا، دیکھا کہ سب سے الگ ایک دور مقام پر کھڑے نماز میں مشغول ہیں، جب فارغ ہوئے تو کہا کہ امیر المؤمنین آپ کو بلا رہے ہیں، جب وہ امیر کے پاس پہنچے تو اس نے وہ قیمتی تاج ہاتھ میں لے کر محمد بن واسع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ابو عبد اللہ! مسلم فوج کو یہ قیمتی تاج غنیمت میں ملا ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ آپ کے حصے میں آئے اور اسے آپ قبول کر لیں، سارے لوگ بھی اس پر راضی ہیں۔

انہوں نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ آپ کو اور پوری فوج کو جزائے خیر دیں، لیکن مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ امیر نے قسم دے کر کہا کہ آپ کو لینا ہی پڑے گا، لہٰذا اس کی قسم کی وجہ سے انہوں نے لے لیا اور اجازت لے کر رخصت ہو گئے، بعض حاضرین نے اس پر طنز بھی کیا؛ لیکن امیر نے کچھ نہیں کہا، البتہ ایک لڑکے کو ان کے پیچھے لگا دیا اور کہا کہ چپکے سے جا کر دیکھو کہ اس تاج کو کیا کرتے ہیں۔

حضرت محمد بن واسع وہ تاج لے کر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بکھرے بال اور پراگندہ حال شخص ملا جو یہ کہہ رہا تھا کہ: اللہ کے دیے ہوئے مال سے کچھ عنایت کر دو۔ شیخ نے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا، جب انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی شخص نہیں دیکھ رہا ہے، تو یہ تاج اس کو دے کر خوشی خوشی اس طرح گزر گئے جیسے اپنے کاندھے سے کوئی بڑا بوجھ اتار کر پھینک دیا ہو۔ پہرے دار نے اس سائل کو پکڑ کر امیر کی خدمت میں حاضر کیا، امیر نے وہ تاج لے کر اسے بہت کچھ دے کر راضی کر دیا، پھر لوگوں کو بتایا کہ میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ ابھی بھی امت محمدیہ ایسے خدا ترس زاہدین سے خالی نہیں ہے۔

﴿إِنَّمَا هَٰذِهِ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا مَتَٰعٌ وَإِنَّ ٱلْأَخِرَةَ هِىَ دَارُ ٱلْقَرَارِ ﴿٣٩﴾﴾ [غافر: ٣٩]

”یہ دنیوی زندگی بس تھوڑا مزہ ہے، اور یقین جانو کہ ہمیشگی کا گھر تو آخرت ہی ہے“۔ [سورۂ مومن: ۳۹]

* * *

۲۷/٦/۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلوک و معرفت

اس خطبے کا موضوع ہے: «الإحسان والمراقبة» احسان کے لغوی معنی ہیں: عمدہ طریقے سے کسی کام کو انجام دینا، خوب صورت بنانا، اچھا برتاؤ کرنا، حسنِ سلوک کرنا، وغیرہ۔ «المراقبة» کے معنی ہیں: نگاہ میں رکھنا، دھیان میں رکھنا وغیرہ۔

اصلاحِ شریعت میں اور عبادات کی لائن میں احسان کے معنی ہیں: بندہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرے گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ بات دل میں پیدا نہ ہو سکے تو یہ ضرور یقین رکھے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے، اسی کو حدیثِ جبریلؑ میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت جبریلؑ حضور ﷺ کی بار گاہ میں آئے اور کہا:

«فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ؟ قَالَ: أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ». [رواه مسلم]

”آپ احسان کے معنی بتائیں؛ حضور ﷺ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، لیکن اگر تم نہ دیکھ سکو، تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے“۔ [مسلم شریف]

اس حدیث پاک کا مُقتضیٰ یہ ہے کہ انسان، ہمیشہ یہ دھیان رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں، وہ اس کے قریب ہیں، اس کے تمام احوال سے باخبر ہیں، کوئی چیز ان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے بندے کی کوئی چیز کیسے پوشیدہ ہو سکتی ہے؟ وہ تو اس کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿١٦﴾﴾ [ق: ١٦]

"اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور اس کے دل میں جو خیالات آتے ہیں، ان (تک) سے ہم خوب واقف ہیں، اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔ [سورۂ ق:۱۶]

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٤﴾﴾ [الملك: ١٤]

"بھلا جس نے پیدا کیا وہی نہ جانے؟ جب کہ وہ باریک بیں، مکمل طور پر باخبر ہے"۔ [سورۂ ملک:۱۴]

عبادات میں حلاوت تب ہی محسوس ہوگی جب عبادت گزار صفتِ احسان کے ساتھ عبادت کرے، اس میں عظمتِ الٰہی اور قربِ الٰہی کا استحضار ہو، اس کے بغیر عبادتیں برائے نام ہوں گی، ان میں لطف نہیں آئے گا، شوق وذوق پیدا نہیں ہوگا، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ وقتاً فوقتاً صحابۂ کرام کو اس کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ابن عمرؓ کے جسم کو پکڑا اور فرمایا:

«اعْبُدِ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ» "تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو"۔ [مسند احمد]

اسی طرح حضرت ابوذر غفاریؓ کو بھی حضور ﷺ نے اسی طرح کی وصیت فرمائی تھی، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں:

«أَوْصَانِي خَلِيلِي ﷺ أَنْ أَخْشَى اللهَ كَأَنِّي أُرَاهُ، فَإِنْ لَمْ أَكُنْ أُرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَانِي». [ابن رجب]

"میرے خلیل ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں اللہ سے اس طرح ڈروں، گویا کہ اسے دیکھ رہا ہوں، لیکن اگر میں نہ دیکھ سکوں تو وہ یقیناً مجھے دیکھ رہا ہے"۔ [جامع العلوم والحکم: ابن رجبؒ]

اللہ کا دھیان اور ترکِ معاصی

عبادات میں احسان کی مشق کرنے اور اس صفت سے خود کو آراستہ کرنے کی وجہ سے یہ صفت دائمی بن جاتی ہے، ہر وقت اللہ کی عظمت و محبت کا استحضار رہنے لگتا ہے، ہر وقت اس کی خشیت دل میں بسی رہتی ہے، احساس "معیّت" سے دل ہر وقت معمور اور مسرور رہتا ہے، کسی گناہ کے خیال سے بھی دل کانپ جاتا ہے، کہ اس کی معصیت کیسے کروں جو ہمارے ساتھ ہے، ہمیں دیکھ رہا ہے، ہمارا ہم نشیں ہے، اس کی حیاء سے انسان کسی معصیت کی جرءت نہیں کرے گا، اسی لیے حدیث میں ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ سے اس طرح حیاء کرو جیسا کہ اس سے حیاء کرنے کا حق ہے"۔

[مسند احمد]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور بکریوں کا چرواہا

ایک چرواہا تھا، جو جنگل میں بکریاں چَراتا تھا، لیکن اس کا دل ایمان ویقین کی دولت

سے مالامال تھا، اس کے دل میں اللہ کی عظمت تھی، خشیت تھی، معرفت تھی، وہ دل، اللہ کی محبت کے ساتھ دھڑکتا تھا، اس میں فکرِ آخرت تھی، اللہ تعالیٰ کا استحضار تھا —— ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ سفر پر نکلے، مدینہ منورہ کے راستے میں انہیں یہ چرواہا مل گیا، اس کا امتحان لینے کے لیے کہا کہ تم ایک بکری ہم سے بیچ دو، تو اس نے کہا: یہ بکریاں میری نہیں ہیں، بلکہ میرے مالک کی ہیں، میں تو ان کا مملوک ہوں۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا: تمہارا مالک جب تم سے اس ایک بکری کے بارے میں پوچھے گا تو کہہ دینا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا۔ یہ سن کر اس چرواہے نے کہا: لا الہ الا اللہ، میں کیسے کہہ دوں گا کہ بھیڑیا کھا گیا؟ اور اللہ کہاں ہے؟ اللہ کی معرفت و محبت اور اس کے استحضار میں ڈوبے ہوئے اس جواب سے حضرت ابن عمرؓ اتنے متأثر ہوئے اور خوش ہوئے کہ اس کے مالک تک پہنچ کر اس غلام کو خرید لیا اور خرید کر اسے آزاد کر دیا۔ [طبرانی]

اس قصے کا سب سے اہم پہلو تو یہی ہے کہ اس چرواہے مومن کے دل میں اللہ کی خشیت تھی، اس کا دھیان اور استحضار تھا، جس کی وجہ سے گناہ کی اسے جرءت نہیں ہوئی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے اللہ کے خوف سے ناجائز اور حرام مال سے اجتناب کیا، جس کے عوض میں اللہ نے اسے نیک نامی بھی دی اور اسے غلامی سے نجات بھی، یہ اس حدیثِ پاک کا مصداق ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

> ”جب تم اللہ کے لیے کوئی چیز چھوڑ دو گے، تو اللہ اس سے بہتر بدلہ تمہیں عطا کرے گا“۔ [مسند احمد]

کتنا حسین اور عظیم جملہ ہے ”أینَ اللہ؟“ اللہ کہاں ہے، کاش کہ یہ جملہ اور چرواہے ”وَلی“ کا یہ مقولہ ہمارا شعار بن جائے اور ہر وقت یہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہے، جب

بھی نفس اور شیطان کے شر کی وجہ سے کسی برے کام کا ارادہ ہو تو فوراً اس جملے کو اپنے سامنے کرلیں اور یاد کرلیں، کسی مسلمان کو دھوکہ دینے کا ارادہ ہو رہا ہو، کسی فحش کام کی نیت ہو رہی ہو، حرام مال کے حصول پر قدرت ہو، کسی انسان پر ظلم کرنے پر نفس ابھارے تو اس طرح کے مواقع پر فوراً اس مقولے کو یاد کرلیں، جو دراصل مفہوم ہے اس آیت کریمہ کا:

﴿أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ ٱللَّهَ يَرَىٰ ﴿١٤﴾﴾ [العلق: ١٤]

"کیا اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟"۔[سورۂ علق:۱۴]

خَيَالُكَ فِي عَيْنِيْ وَذِكْرُكَ فِي فَمِيْ
وَمَثْوَاكَ فِي قَلْبِيْ فَكَيفَ تَغِيْبُ

"تیرا تصور میری نگاہ میں ہے اور تیری یاد میری زبان پر ہے، تیرا ٹھکانا میرے دل میں ہے، پھر تو جائے گا کہاں؟"۔

امام احمد بن حنبلؒ اور خشیتِ الٰہی

حضرت امام احمد بن حنبلؒ جلیل القدر امام اور عابد و زاہد اور تقویٰ شعار محدث و فقیہ تھے، جب تنہائی میں ہوتے تو ان کی خشیت میں اضافہ ہو جاتا، گریہ و زاری بڑھ جاتی، کسی نے دریافت کیا کہ جب آپ مجلس میں ہوتے ہیں تو آپ کی کیفیت دوسری ہوتی ہے، لیکن جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو کیفیت بدل جاتی ہے؟ کہنے لگے: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«أَنَا جَلِيسُ مَنْ ذَكَرَنِي» "یعنی میں اپنے یاد کرنے والے کا ہم نشین ہوں"۔

لہٰذا جب میں تنہائی میں اللہ کا ذکر کرتا ہوں، تو اس وقت احکم الحاکمین کی ہم نشینی کے آداب ملحوظ رکھتا ہوں۔

قرآنِ کریم سے بھی ذکر و دعاء کے وقت قربِ الٰہی کی صراحت ملتی ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرة: ١٨٦]

”اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجیے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں“۔[سورۂ بقرۃ:۱۸۶]

علامہ ثعلب الادیب ایک روز امام احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے امام صاحب نے ان کا تعارف چاہا تو انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور شعر وادب سے اپنی دلچسپی بھی بتائی، تو امام صاحب نے ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی، علامہ ثعلب نے کہا: ابونواس کہتا ہے:

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْماً فَلا تَقُلْ
خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيبُ
وَلا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ طَرْفَةً
وَلا أَنَّ مَا يَخْفَى عَلَيْهِ يَغِيبُ

”جب کبھی تمہیں تنہائی میسر ہو تو یہ نہ کہو کہ میں خلوت میں ہوں، (مجھے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے) لیکن یہ کہو کہ میرے اوپر نگہ بان ہے۔ تمہیں ہرگز یہ خیال نہ آئے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اللہ غافل ہے، اور نہ یہ کہ پوشیدہ چیزیں اس سے چھپ سکتی ہیں“۔

ثعلب کہتے ہیں کہ امام صاحب نے یہ سن کر اپنی کتابیں، اور قلم دوات سب چھوڑ کر

دروازہ بند کرلیا اور روتے رہے اور ان اشعار کو بار بار پڑھتے رہے۔

(بعض لوگوں نے ان اشعار کو ابوالعتاہیہ کی طرف منسوب کیا ہے اور بعض نے امام شافعیؒ کی طرف)

حقیقت یہ ہے کہ جسے آخرت کا استحضار اور اللہ تعالیٰ کا دھیان اور صفتِ احسان کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو جائے، اس کا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے ہوگا، اسے عبادات میں لذت محسوس ہوگی، بلکہ خدمتِ خلق میں بھی لطف آئے گا، محتاجوں کی حاجت روائی، کمزوروں کی دادرسی اور مسکینوں کی مدد میں وہ اللہ کی خوش نودی تلاش کر رہا ہوگا۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کا حال سکرات کے وقت

حضرت معاذ بن جبلؓ کی وفات کا وقت جب آیا تو اپنے صاحب زادے سے فرمایا: باہر نکل کر دیکھو کہ صبح ہوئی یا نہیں؟ انہوں نے جاکر دیکھا اور آکر جواب دیا کہ ابھی صبح نہیں ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت معاذ نے اپنی نظر اوپر اٹھائی اور کہا: اے اللہ! تو تھوڑے میں برکت دے کر بڑھا دیتا ہے، لہٰذا میری اس بیماری اور زخم میں برکت دے (اس وقت وہ طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے) بیٹے نے کہا: آپ اپنے لیے بددعا کیوں کر رہے ہیں؟ موت وہلاکت کی آرزو کیوں کر رہے ہیں؟ کہنے لگے: بخدا میں زندگی سے اکتا گیا ہوں، اب جینے کی تمنا نہ رہی۔ پھر بیٹے سے کہا کہ جاکر دیکھو صبح ہوئی یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ صبح ہوگئی ہے، حضرت معاذ نے کہا: «أعوذ بالله من صباح إلى النار» ”میں ایسی صبح سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جو جہنم میں لے جائے“۔ پھر کہا:

”اے اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں زندگی اس لیے پسند نہیں کرتا تھا تاکہ شجرکاری کروں، اور نہریں کھودوں، یا مکانات ومحلات تعمیر کروں؛ بلکہ مجھے زندگی

اس لیے عزیز تھی، تاکہ سخت گرمی میں روزہ رکھوں، اپنے گھٹنوں کے بل جاکر علمائے کرام کے حلقاتِ علم میں شرکت کروں اور سجدے کی حالت میں اپنے چہرے کو اپنے رب کے سامنے ذلیل کروں“۔

حضرت امام اعمشؒ کی وفات کا جب وقت آیا تو ان کے بچے رونے لگے، انہوں نے اپنے بچوں کو مخاطب کرکے کہا: میرے پیارے بچو! تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ساٹھ سال سے میری تکبیرۂ اولیٰ فوت نہیں ہوئی، گویا کہ اللہ کی رحمت سے پر امید ہوں، وہ اچھا ہی معاملہ کرے گا۔ اور یہ بات انہوں نے کبر وغرور یا خود پسندی کی بنا پر نہیں کہی، بلکہ تکبیرۂ اولیٰ کی اہمیت بیان کرنے، ان کو اس کی ترغیب دینے اور اللہ کی رحمت سے امید ظاہر کرنے کے لیے کہی تھی۔

زہد وعبادت کے رسیا حضرت ابن ادریسؒ کی وفات کا وقت آیا تو ان کا بیٹا ان کے سرہانے بیٹھ کر رو رہا تھا، تو انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: بیٹے! اللہ سے ڈرتے رہنا اور جس گھر میں ہم ایک ساتھ رہے، اس میں کبھی بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرنا، خدا کی قسم میں نے اس گھر میں چار ہزار مرتبہ قرآن ختم کیا ہے۔ [سیر اعلام النبلاء للذہبی]

یہ وہ لوگ تھے جنہیں جنت کا شوق تھا، اپنے رب سے خندہ رو ہوکر ملنے کی آرزو تھی، دیدارِ الٰہی کے شوق نے اور حصولِ جنت کی طمع نے ان کے اندر اخلاص وللّٰہیت اور احسان وسلوک اور حسنِ عمل کا ایسا داعیہ پیدا کیا تھا کہ گویا کہ آخرت اور آخرت میں پیش آنے والے مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾

[القيامة: ٢٢ – ٢٣]

”اس روز بہت سے چہرے شاداب ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے“۔[سورۂ قیامۃ:۲۲-۲۳]

﴿لَهُم مَّا يَشَآءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿٣٥﴾﴾ [ق: ٣٥]

”ان جنتیوں کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہاں وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس کچھ اور زیادہ بھی ہے“۔[سورۂ ق:۳۵]

جنتی جو چاہیں گے وہ انہیں ملے گا، لیکن کچھ چیزیں ان کے تصور سے بالاتر ہوں گی، ان کے خیال میں بھی نہیں ہوں گی، وہ بھی اللہ تعالیٰ عنایت فرمائیں گے۔

مسلم شریف کی روایت میں اس کی مزید تفصیل ذکر کی گئی ہے:

«إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ، قَالَ: يَقُولُ اللهُ تَبَارَكَ وتَعَالَى: تُرِيدُونَ شَيْئًا أَزِيدُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوهَنَا؟ أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: فَيُكْشَفُ الْحِجَابُ، فَمَا أُعْطُوا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَى رَبِّهِمْ عَزَّ وَجَلَّ».

[رواه مسلم]

”جب جنتی، جنت میں داخل ہوجائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں مزید کچھ عطا کروں؟ وہ جواب دیں گے: کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں کیے؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور دوزخ سے نجات نہیں دی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: سو اللہ تعالیٰ پردہ اٹھادیں گے، لہٰذا انہیں کوئی چیز اپنے رب کے دیدار سے زیادہ محبوب عطا نہیں کی گئی ہوگی“۔[مسلم شریف]

صفتِ احسان، ایمان کا اعلیٰ مرتبہ

در حقیقت صفتِ احسان، ایمان کا بلند ترین مرتبہ ہے، جس شخص کو یہ کیفیت حاصل ہوجائے اسے خیر کثیر مل گئی، اسے عبادات میں لطف آئے گا اور گناہوں کی جرءت نہیں ہوگی، اس صفت کی وجہ سے فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کی کثرت کی بھی توفیق مل جاتی ہے، کیوں کہ بندہ جب صفتِ احسان کے ساتھ اپنے رب کی بارگاہ میں ذکر و مناجات میں مشغول ہوتا ہے تو وہ اپنے دل کی کیفیات کو بیان نہیں کرسکتا، وہ اپنے استغراق اور وَجد وسُرور میں ایسا مگن ہوتا ہے کہ اپنے محبوب حقیقی کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی صرفِ نظر کرنا نہیں چاہتا (بقول خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ) کے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی　　　اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اس وصف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر وقت یہ دھیان رہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے، ہر بات سن رہا ہے۔ اس کے باوجود قیامت کے روز باضابطہ عدالت قائم ہوگی، ثبوت فراہم کیے جائیں گے، گواہوں سے گواہی لی جائے گی، تاکہ کسی کو انکار کا موقع نہ ملے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے جو نیکی اور بدی لکھتے ہیں:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِينَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ﴿١٢﴾﴾ [الانفطار: ۱۰ – ۱۲]

”اور بے شک تم پر کچھ نگراں (فرشتے) مقرر ہیں، وہ معزز لکھنے والے ہیں، جو تمہارے سارے کاموں کو جانتے ہیں“۔ [سورۂ انفطار: ۱۰–۱۲]

﴿مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴿١٨﴾﴾ [ق: ۱۸]

”انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگراں مقرر ہوتا ہے، ہر وقت (لکھنے کے لیے) تیار ہے“۔[سورۂ ق:۱۸]

پھر قیامت کے روز یہ صحائف بندے کے سامنے رکھ دیے جائیں گے، جنھیں وہ خود ہی پڑھ لے گا، نہایت باریکی کے ساتھ، امانت داری کے ساتھ اس کی تمام حرکتیں لکھی ہوں گی۔

﴿ وَكُلَّ إِنسَٰنٍ أَلْزَمْنَٰهُ طَٰٓئِرَهُۥ فِى عُنُقِهِۦ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ كِتَٰبًا يَلْقَىٰهُ مَنشُورًا ﴿١٣﴾ ٱقْرَأْ كِتَٰبَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ ٱلْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ﴿١٤﴾ ﴾ [الإسراء: ١٣ – ١٤]

”اور ہر شخص کے عمل کا انجام ہم نے اس کے اپنے گلے سے چمٹا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم (اس کا) اعمال نامہ ایک تحریر کی شکل میں نکال کر اس کے سامنے کر دیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔ (کہا جائے گا) لو پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہو“۔[سورۂ اسراء:۱۳–۱۴]

ان تمام شواہد کے ہوتے ہوے عدالت کے سامنے ایک اور گواہی پیش کی جائے گی، جب بندہ، فرشتوں کی لکھی ہوئی تحریر کو نہیں مانے گا، تو اس کی زبان پر مہر لگادی جائے گی، پھر اس کے ہاتھ پیر گواہی دیں گے۔

﴿ ٱلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰٓ أَفْوَٰهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾ ﴾ [يس: ٦٥]

”آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے، اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کمائی کیا کرتے

تھے"۔[سورہ یٰسین:٦٥]

بلکہ جس سرزمین پر گناہ کیا گیا ہوگا وہ بھی گواہی دے گی:

﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ﴿٤﴾ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ﴿٥﴾﴾

[الزلزلة: ٤ — ٥]

"اس دن زمین اپنی ساری خبریں بتادے گی، کیوں کہ تمہارے پروردگار نے اسے یہی حکم دیا ہوگا"۔[سورۂ زلزلۃ:۴-۵]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور صحابہؓ سے فرمایا:

"کیا تم جانتے ہو کہ زمین کی خبریں کیا ہیں؟ صحابۂ کرام نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنَّ أَخْبَارَهَا أَنْ تَشْهَدَ عَلَى كُلِّ عَبْدٍ وَأَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلَى ظَهْرِهَا، أَنْ تَقُولَ: عَمِلَ كَذَا وَكَذَا فِي يَوْمِ كَذَا وَكَذَا».

[رواه الترمذي]

"اس کی خبریں یہ ہیں کہ ہر مرد اور ہر عورت کے خلاف گواہی دے گی، جو کام بھی انہوں نے زمین پر کیا ہوگا، وہ یہ کہے گی کہ انہوں نے فلاں فلاں دن، ایسا ایسا کام کیا"۔[ترمذی شریف]

جس شخص کو ان تمام باتوں کا استحضار ہوگا کہ فرشتے گواہی دیں گے، اس کے تمام اعمال کو تحریری شکل میں پیش کریں گے، اس کے اعضاء وجوارح گواہی دیں گے، زمین گواہی دے گی —— یقیناً وہ کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا، لیکن اگر کبھی گناہ صادر ہو بھی جائے تو فوراً توبہ واستغفار کرے گا، تاکہ وہ گناہ، دفتر سے مٹادیا جائے۔

یہی وہ استحضار اور "احسان" تھا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو معصیت میں پڑنے سے بچایا، انہیں گناہ کی طرف دعوت دی گئی گناہ کرنے پر قدرت بھی تھی، لیکن انہوں نے صاف لفظوں میں «مَعَاذَ اللّٰہِ» کہا کہ اس گھٹیا اور گندے کام سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

یہی "مراقبہ" یعنی رب ذوالجلال کا دھیان اور اس کی بارگاہ میں حساب وکتاب اور بازپُرسی کا خوف انسان کو ہر برے کام سے روک سکتا ہے: خواہ وہ مالِ حرام ہو، کسی مسلمان کو اذیت پہنچانا ہو، کسی کی عزت وآبرو پہ حملہ کرنا ہو، تکبر اور گھمنڈ ہو، بدکاری اور بدفعلی ہو، گویا کہ ہر گناہ سے انسان بچ سکتا ہے اگر صفتِ احسان سے متّصف ہو جائے۔

* * *

۲۲/صفر/۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی اُخوّت اور دینی حمیّت ــــــ تقاضے اور فوائد

ایک وقت تھا جب دنیا کی زمامِ قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، دنیا کے چپے چپے میں ان کا چرچا تھا، ان کی حکمرانی تھی، ہر جگہ ان کی نیک نامی تھی، ایمان وقرآن کا قیمتی سرمایہ لے کر نکلے اور ملکوں کو فتح کرتے گئے، علم واحسان کے ذریعے آگے بڑھتے گئے، اخلاق وکردار کے ذریعے دلوں کو جیتتے گئے، عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کی، جو امانت ان کے سپرد کی گئی تھی اسے بغیر کم وکاست کے ادا کیا، وہ خیر وبھلائی کے علم بردار اور رشد وہدایت کے داعی تھے۔

ان کی ایمانی فوجیں حق کا پرچم لے کر دنیا کے گوشے گوشے میں گئیں، کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، ان کے سامنے حق وباطل کے درمیان فرق کو کھول کر رکھا، ہر کمزور کا ساتھ دیا، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کی اور صداقت وامانت کا پیکر بن کر رشد وہدایت کا سبق دیا۔

ان کی اپنی ترقی یافتہ تہذیب تھی، جس میں علم ویقین کا سنگم تھا، جس میں زمین وآسمان اور دنیا وآخرت کے درمیان خوب صورت اور طاقت ور رابطہ تھا، جہاں قلب ودماغ

اور مادیت وروحانیت کے درمیان مضبوط رشتہ قائم تھا، جہاں افراد کے حقوق اور جماعتوں کی مصلحت کے درمیان ہم آہنگی تھی۔

دنیا کی یونیورسٹیوں میں مسلم اسکالرس کی لکھی ہوئی کتابیں شاملِ نصاب تھیں، مسلم ”علماء“ کے نام دنیا کے مشہور ترین ناموں میں ہوا کرتے تھے، ذریعۂ تعلیم ہر جگہ عربی زبان تھی، ہماری شان وشوکت کا یہ عالم تھا کہ ایک خلیفہ نے ایک روز بادلوں کی طرف نگاہ اٹھائی اور انہیں مخاطب کر کے کہا:

«شَرِّقِيْ أَوْ غَرِّبِيْ، فَسَتَأْتِيْ ثَمْرَةُ خِرَاجِكِ إِلَى بَيْتِ مَالِ الْـمُسْلِمِيْنَ».

”تم مشرق میں جاکر برسو یا مغرب میں، تمہارے خراج کا غلہ مسلمانوں کے بیت المال میں ہی آئے گا“۔

ہمارے عروج کا یہ حال تھا جو ذکر کیا گیا، یہاں تک کہ دورِ جدید آیا، حالات یکسر پلٹ گئے، ہم اگلی صف سے بالکل پچھلی صف میں پہنچ گئے، کبھی ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوم تھے جب کہ اس وقت ہم ترقی پذیر قوم ہیں — ہم ترقی یافتہ اس وقت تھے جب ہم متحد تھے، پوری امت تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دھاگے میں پروئی ہوئی تھی، دلوں میں جوڑ تھا، اسی طرح روح اور جسم کا باہمی رابطہ تھا، دلوں پر تقویٰ کی حکمرانی تھی، اعضا وجوارح، اسلامی احکام کے پابند تھے، پاکیزہ ذہن ودماغ سے بلند ترین افکار وخیالات کے چشمے پھوٹتے تھے، افکار ونظریات میں حرکت تھی، نشاط تھا، قوت تھی، ابداع تھا، جس کے نتیجے میں نئی نئی ایجادات واختراعات کا تسلسل تھا، صنعت خانے آباد تھے، جس کی وجہ سے امت خود کفیل تھی، بلکہ ان کی مصنوعات برآمد ہوتی تھیں، اس لیے معیشت مضبوط تھی۔

پوری امت ایک جسم کی طرح ہے

عروج وترقی کے دن مسلمانوں نے اس وقت دیکھے تھے جس وقت امت کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس عظیم اسلامی عمارت کا ایک جزو ہے، کیوں کہ امتِ مسلمہ ایک جسم کی طرح ہے، اگر کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچے گی تو تمام اعضاء اسے محسوس کریں گے، جسم کی کوئی ایک ہڈی خدانخواستہ ٹوٹے گی تو سارا جسم تڑپ اٹھے گا، جس طرح عمارت کی تمام اینٹیں مل کر عمارت کو مضبوط بناتی ہیں، اسی طرح امت کا ہر فرد مل کر امت کو مضبوط بناتا ہے، ایک دوسرے کی خوشی اپنی خوشی سمجھے اور رنج ومصیبت کو اپنی مصیبت سمجھے۔

دوسری قوموں کے سامنے ہم نے اپنی بالاتری اس وقت ثابت کی تھی، جس وقت ہم میں کا ہر فرد اپنی ذمے داری کو سمجھتا اور ادا کرتا تھا: عالِم اپنے علمی تقاضے کو پورا کرتے ہوے عوام کے تئیں اپنی ذمے داری پوری کرتا تھا، مال دار، فقیر کے ساتھ، طاقتور، کمزور کے ساتھ اور حکمراں اپنی رعایا کے ساتھ ہم دردانہ اور خیر خواہانہ برتاؤ کرتا تھا، کیوں کہ اسلامی اُخوت ان کے سلوک ومعاملات پر پوری طرح اثرانداز رہتی تھی۔

ایک مسلم عورت کے حجاب کا مسخرہ اور ایک مسلمان کی غیرتِ ایمانی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا، وہ اس طرح کہ ایک صحابی کی اہلیہ محترمہ اپنے حجاب کے ساتھ بازار گئیں، ایک یہودی نے ان کے حجاب کا مذاق اڑایا، حجاب کا پچھلا حصہ چپکے سے باندھ دیا، تاکہ جب اٹھیں تو بے پردہ ہوجائیں، چناں چہ ایسا ہی ہوا، پھر دوسرے یہودی قہقہہ لگانے لگے۔ یہ منظر ایک

مسلمان دیکھ رہا تھا، اس کی ایمانی غیرت ابل پڑی، اسلامی حمیّت کا شعلہ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شیر کی طرح اس خبیث یہودی پر جھپٹ پڑے اور اسے قتل کر دیا، چوں کہ وہاں بڑی تعداد میں یہود جمع تھے، اس لیے انہوں نے اس مسلمان کو بھی شہید کر دیا۔ جب رسول اکرم ﷺ کو اور صحابۂ کرامؓ کو اس کی خبر ملی تو ان تمام یہودیوں کا محاصرہ کر لیا، تقریباً پندرہ روز تک محاصرہ قائم رہا، یہاں تک کہ وہ سب مجبور ہو کر اپنے قلعوں سے اترے، پھر حضور ﷺ نے حکم فرمایا کہ سب کو گرفتار کیا جائے، یہ واقعہ بنی قینقاع کے موقع پر پیش آیا تھا، بلکہ یہی واقعہ غزوے کا سبب بنا۔ اس طرح مسلمان ایک دوسرے سے مربوط تھے، ایک دوسرے کے لیے جان تک دیتے تھے، ان کے اندر اسلامی غیرت تھی، اُخوّت تھی، شجاعت تھی، اخلاص تھا۔

ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آتے تھے، مظلوموں کی دادرسی کرتے تھے، ضرورت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی مدد کرتے تھے، اجنبیوں اور مسافروں اور غم زدوں کی غم خواری کرتے تھے، تنگ دست، مقروض کو مہلت دیتے تھے، گویا کہ معاشرہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تھا، یک جہتی اور اتحاد کا بے مثال نمونہ تھا، ان اخلاقی اقدار کی اہمیت ان کے نزدیک نفلی عبادات سے زیادہ تھی۔

ان اللہ والوں کے سامنے ہمیشہ یہ فرمانِ رسولؐ رہا کرتا تھا:

«مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ

أَخِيهِ...». [رواه مسلم]

”جس شخص نے کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی، اللہ اس کی قیامت کے روز کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا، اور جس شخص نے کسی تنگ دست کے لیے آسانی پیدا کی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت کی آسانیاں مہیا فرمائے گا، اور جس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں پردہ پوشی کرے گا، اور اللہ تعالیٰ بندے کی اس وقت تک مدد کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے“۔[رواہ مسلم]

رابطۂ اسلامی کے تقاضے

اسلامی اُخوت اور اسلامی رابطے کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی کے دکھ درد میں شریک ہوں، اس کے رنج وغم میں اس کی غم خواری کریں، ناگہانی آفت ومصیبت میں اس کے کام آئیں؛ لیکن اگر خدانخواستہ اس طرح کے ہمدردانہ جذبات سے آپ محروم ہیں، دوسروں کے مصائب وآلام کا آپ پر کوئی اثر نہیں، تو اس سنگ دلی کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اندر کے خیر خواہانہ جذبات مر چکے ہیں، اخلاقِ فاضلہ منجمد ہو چکے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث پاک پہ غور کریں اور اپنا جائزہ لیں:

«مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى». [رواه مسلم]

"مسلمانوں کی باہمی محبت، رحم دلی اور ہم دردی کی مثال ایک جسم کی طرح ہے، جب کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے، تو سارا جسم بیداری اور بخار کا شکار ہوتا ہے"۔ [مسلم شریف]

حقیقی ہم دردی یہ ہے کہ جب آپ کسی بھائی کو تنگ حال اور ستم رسیدہ پائیں، تو آپ کو اس وقت تک چین نہ آئے جب تک اپنی استطاعت کے بقدر اس کا تعاون کر کے اس کی مصیبت ہلکی نہ کر دیں؛ بلکہ آپ کے بیدار ضمیر ہونے کی علامت یہ ہے کہ جب آپ کسی کے کام آجائیں اور آپ کے توسط سے کسی کو راحت مل جائے تو اللہ کا شکر ادا کریں، آپ کی پیشانی کی لکیروں میں انبساط آجائے، چہرہ کِھل جائے، جیسا کہ اس طرح کے مواقع پر کسی کا تعاون کر کے اور اس کی مصیبت دور کر کے رسول اللہ ﷺ خوش ہوتے تھے۔

حضرت منذر بن جریرؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم دن کے ابتدائی حصے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ کچھ لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن، سوراخ والی چادریں یا عبائیں گلے میں ڈالے ہوئے اور تلواریں لٹکائے ہوئے آئے۔ ان میں کے اکثر لوگ، بلکہ سارے کے سارے لوگ قبیلۂ مضر سے تعلق رکھتے تھے، ان کی خستہ حالی کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، آپؐ اندر تشریف لے گئے، پھر باہر تشریف لائے تو حضرت بلالؓ کو حکم دیا، انہوں نے اذان دی اور اقامت کہی، آپؐ نے نماز ادا کی پھر خطبہ دیا اور فرمایا: "اے لوگو! تم اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا.... آیت کے آخر تک۔ "بے شک تم پر اللہ نگراں ہے" اور وہ آیت پڑھی جو سورۂ حشر میں ہے "اللہ سے ڈرو اور ہر نفس یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا بھیج رکھا ہے (چناں چہ) کسی نے اپنے دینار سے، اپنے درہم سے،

اپنے کپڑے سے، اپنے گندم کے صاع سے، اپنی کھجور کے صاع سے صدقہ کیا — یہاں تک کہ آپؐ نے فرمایا: اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، صدقہ کرو — جریرؓ نے کہا: انصار میں سے ایک شخص ایک تھیلی لے کر آیا، اس کی ہتھیلی اسے اٹھانے سے عاجز ہونے لگی تھی، بلکہ عاجز ہوگئی تھی، پھر لوگوں کا تانتا بندھ گیا، یہاں تک کہ میں نے کھانے اور کپڑوں کے دو ڈھیر دیکھے، حتی کہ میں نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا چہرۂ انور دیکھا کہ وہ اس طرح کِھل رہا تھا جیسے اس پر سونا چڑھا دیا گیا ہو، پھر آپؐ نے فرمایا:

> "جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کیا، تو اسے اس کا اجر ملے گا اور اس کے بعد جو اس پر عمل کرے گا اس کا اجر بھی ملے گا، ان کے اجر میں کسی طرح کی کمی کیے بغیر، اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ رائج کیا تو اس (گناہ) کا بوجھ بھی اس کے اوپر ہو گا اور جو اس پر بعد میں عمل کرے گا، اس کا بھی، ان کے بوجھ میں کمی کیے بغیر"۔ [مسلم شریف]

یہ حالت تھی سرورِ دوعام صلی اللہ علیہ وسلم کی، مسلمانوں کی پریشانی اور ان کی فاقہ زدہ حالت دیکھ کر بے تاب ہوجاتے تھے، ان کی راحت رسانی کی فکر میں بے چین ہوجاتے تھے، پھر جب ان کی مدد کی جاتی، تو آپؐ کا چہرۂ انور خوشی سے دمکنے لگتا تھا۔

جلاوطن اور پناہ گزین مسلمان

اس وقت ایک بڑی تعداد ہے ہمارے ان بھائیوں اور بہنوں کی جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں، پناہ گزین کی حیثیت سے جگہ جگہ خیموں میں پڑے ہوئے ہیں، بھوکے پیاسے، بے یار و مددگار، بے کسی اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اپنے ملک

ومال، اہل وعیال، مکان اور اپنی زمین وجائیداد سے محروم ہو چکے ہیں، کھلے آسمان کے نیچے، شدید کڑاکے کی سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں، ان میں سے بعض ٹھٹھر کر جاں بحق ہو چکے ہیں، بعض بھوک پیاس کی شدت اور خوف وہراس کی وجہ سے دم توڑ چکے ہیں، ہماری غیرت ایمانی کو کیا ہو گیا ہے؟ ہماری اسلامی حمیت کہاں چلی گئی ہے؟ ایک عورت کے پردے کی بے حرمتی کی وجہ سے اپنی جان کی بازی لگانے والوں کی اولادیں کہاں گئیں؟ ہمیں اپنا جائزہ لینا ہو گا کہ کیا ہمارا ضمیر زندہ ہے؟ یا عیش وعشرت کی نذر ہو چکا ہے؟

میرے بزرگو! امتِ مسلمہ کو انانیت اور خود پسندی اور خود غرضی کی تعلیم نہیں دی گئی ہے، ہماری نسبت ان مقدس ہستیوں سے ہے جنہوں نے جان لیوا پیاس کی شدت میں بھی ایثار کیا اور پانی کا گھونٹ لے کر اپنی جان بچانے کے بجائے اپنے پیاسے، دم توڑتے بھائی کی طرف اشارہ کیا اور خود اپنے خالق ومالک سے جا ملے۔

انسان، اپنے اندر ہم دردی اور خیر خواہی کے جذبات اس وقت محسوس کرتا ہے جب وہ خستہ حال اور پریشان لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا اور ان کے احوال سے باخبر ہوتا ہے، وہ اپنے دل سے انسانیت کے تئیں پیار اور محبت اور غم خواری کی دھڑکن اس وقت سنتا ہے، جب وہ خود حالات کے تھپیڑوں سے گزرتا ہے، پھر وہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے، بے گھر اور پناہ گزینوں کی غم خواری کرتا ہے، آفت زدہ لوگوں کی داد رسی کرتا ہے، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے، محتاجوں پر مال خرچ کرتا ہے اور عزت دار بھائی اگر ذلیل ہو گیا ہو تو اس کی تکریم کرتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: «أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ؟» یعنی بہتر اسلام کیا ہے؟ اس

کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

«تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتُقْرِئُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ». [متفق عليه]

"تم کھانا کھلاؤ اور جسے پہچانتے ہو اسے بھی اور جسے نہیں پہچانتے ہو اسے بھی سلام کرو"۔ [متفق علیہ]

جو لوگ کار خیر میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، صدقات و خیرات اور ہدایا و تحائف کے ذریعے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور انہیں فرحت بخشتے ہیں، ان کے لیے بڑی بشارتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن شَىْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُۥ ۖ وَهُوَ خَيْرُ ٱلرَّٰزِقِينَ ﴿٣٩﴾﴾ [سبأ: ٣٩]

"اور جو چیز بھی تم خرچ کرتے ہو، وہ اس کی جگہ اور چیز دے دیتا ہے، اور وہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے"۔ [سورۂ سبا:۳۹]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ثَلَاثَةٌ أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ وَأُحَدِّثُكُمْ حَدِيثًا فَاحْفَظُوهُ، قَالَ: مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ، وَلَا ظُلِمَ عَبْدٌ مَظْلَمَةً فَصَبَرَ عَلَيْهَا إِلَّا زَادَهُ اللهُ عِزًّا، وَلَا فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ إِلَّا فَتَحَ اللهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ». [رواه الترمذي]

"میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں، اور تمہیں ایک بات بتاتا ہوں جسے یاد رکھو: کسی بندے کا مال، صدقہ دینے سے کم نہیں ہوتا، اور کسی بندے پہ کسی طرح

کا ظلم ہوا ہو، پھر اس نے اس پر صبر کر لیا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ فرماتا ہے، اور کوئی شخص سوال (مانگنے) کا دروازہ کھولتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تنگ دستی کا درواز کھول دیتا ہے"۔[ترمذی شریف]

انانیت اور خود پسندی

انانیت اور خود بینی و خود پسندی، خطرناک اور ہلاکت خیز بیماری ہے، جب یہ بیماری کسی شخص کو لگ جاتی ہے، تو اس کے اندر سے بھلائیاں نکال کر برائیاں بھر دیتی ہے، وہ اپنی ذات کا ایک دائرہ متعیّن کر کے، اسی کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے، اس سے باہر کی دنیا میں نکلنا پسند نہیں کرتا، صرف اپنی مصیبت پہ رنجیدہ ہوتا ہے اور اپنی راحت پہ خوش ہوتا ہے، رہی بات دوسروں کی محتاجگی، فاقہ زدگی، تنگ حالی اور زبوں حالی کی، تو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ اس قدر کوتاہ نظر اور تنگ ظرف اور خود غرض ہوتا ہے کہ اپنے مفاد کے سوا کسی کے مفاد کو نہ سمجھتا ہے نہ اسے کوئی اہمیت دیتا ہے؛ حالاں کہ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی اور دنیا کی رونقیں ہمیشہ نہیں رہتیں، اسی طرح یہاں کے برے دن اور ناخوش گوار حالات بھی کسی قوم یا فرد کا لازمی حصہ نہیں ہیں، نہ انہیں دوام ہے، نیز یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر اللہ نے دنیاوی انعامات سے نوازا ہے تو شکر گزاری اس کی بقاء کا ضامن ہے، اور ناشکری اس کی تباہی اور خاتمے کی گھنٹی ہے؛ چناں چہ تاریخ بتاتی ہے کہ بے شمار اہل ثروت جو غرور اور سنگ دلی کا شکار ہوئے اور انہوں نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر نہیں کی، ان کی دولت و ثروت کو زوال آیا، سب کچھ لٹ گیا، پھر صحت بھی جاتی رہی، معاشرے کی وجاہت ختم ہوگئی، ایک وقت تھا جب وہ معزز سمجھے جاتے تھے، پھر ذلیل ہوگئے، غنی تھے، پھر فقیر ہوگئے۔

رحمتِ عالمؐ کی امت! تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا، مخلوقِ خدا پر خرچ کرو، خالق تم پر خرچ کرے گا، دوسروں کی حاجت روائی کیا کرو، تمہاری حاجت روائی کی جائے گی، بے جھجک اعتدال کے ساتھ اپنا مال خرچ کرو، عرش والے سے تنگی کا اندیشہ نہ رکھو، بلکہ خوش حالی کی امید رکھو، برکتوں کی امید رکھو، یاد رکھو کہ جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملے کی اہمیت کو نہیں سمجھتا اس کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی واسطہ نہیں جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

بذل وعطا سے صرف دوسروں کا ہی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ خرچ کرنے والا خود بھی مستفید ہوتا ہے، اس کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں، ناگہانی آفتوں سے اور بلاؤں سے حفاظت ہوتی ہے۔

﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ﴿٥﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ﴿٦﴾ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ﴿٧﴾﴾ [الليل: ٥ - ٧]

”جس کسی نے (اللہ کے راستے میں) مال دیا، اور تقویٰ اختیار کیا اور سب سے اچھی بات کو دل سے مانا، تو ہم اس کو آرام کی منزل تک پہنچنے کی تیاری کرادیں گے۔ [سورۃ اللیل: ۵-۷]

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ریاکاری، ایک بڑی بیماری

اللہ تعالیٰ بندے کا صرف وہی عمل قبول فرماتے ہیں جو خالص ان ہی کے لیے کیا گیا ہو، کسی غیر کی اس میں کسی طرح کی شرکت نہ ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسی کا حکم فرمایا ہے:

﴿وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا لِيَعۡبُدُواْ ٱللَّهَ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤۡتُواْ ٱلزَّكَوٰةَۚ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلۡقَيِّمَةِ ۝٥﴾ [البينة: ٥]

”اور ان کو اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی کو بالکل یکسو ہو کر صرف اسی کے لیے خالص رکھیں، اور نماز قائم کریں، اور زکاۃ ادا کریں اور یہی ہے سیدھی ملت کا دین“۔[سورۂ بینہ:۵]

اس کے برعکس اگر کسی نے دکھاوے کے لیے کوئی نیک عمل کیا، اس عمل کے پس پردہ کوئی دنیوی مقصد رہا، اپنی نیک نامی پیشِ نظر رہی یا ثناء اور ستائش کی طلب میں کیا تو نہ صرف یہ کہ وہ ناقابل قبول ہوگا؛ بلکہ اس کی وجہ سے آخرت کا بھاری خسارہ ہوگا۔

ریا ایک بیماری ہے، جس کا تعلق قلب سے ہے، مریضِ قلب، جب کچھ کہتا ہے، تقریر کرتا ہے یا خطبہ دیتا ہے، علم حاصل کرتا ہے یا دوسروں کو تعلیم دیتا ہے، یا کوئی (بہ ظاہر)

عمل صالح کرتا ہے، راہِ خدا میں مال خرچ کرتا ہے اور اس سے مقصود رضائے خداوندی نہیں ہوتی، تو اس کا ظاہر بڑا حسین ہوتا ہے، لیکن باطن قبیح اور بدترین ہوتا ہے، نمازیں پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، صدقات وخیرات کرتا ہے، حج وعمرہ کرتا ہے، اسلامی امور سے اپنی گہری دلچسپی ظاہر کرتا ہے، قیامت کے ہولناک منظر کو یاد کرکے اور بیان کرکے اپنی آواز میں تبدیلی پیدا کرلیتا ہے، بھرّائی ہوئی آواز سے اپنی فکرمندی ظاہر کرتا ہے، سر جھکا کر بھاری بھرکم انداز میں چلنے کی کوشش کرتا ہے، اہل علم کی طرح گفتگو کرتا ہے، اپنے ہونٹوں کو حرکت دے کر ذاکرین کی نقل کرتا ہے، حالاں کہ ان تمام اعمال کے پیچھے ریا کی نیت چھپی رہتی ہے، دل کا تعلق اللہ تعالیٰ کے بہ جائے کسی اور کے ساتھ ہوتا ہے، تعریف وتوصیف کی طلب ہوتی ہے، مخلوق کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا یا کوئی منفعت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، کارِ خیر اس لیے نہیں کرتا کہ اس سے محبت ہوتی ہے، برے کام اس لیے نہیں چھوڑتا کہ اس سے نفرت ہوتی ہے، جب تنہائی میں ہوتا ہے تو اللہ کی حدود کو پار کرجاتا ہے، خلوت میں رہتے ہوئے نیک عمل میں سستی کرتا ہے، جب مجمع میں ہوتا ہے تو عمل میں چستی دکھاتا ہے، صالحین کا لبادہ اوڑھے رہتا ہے، حالاں کہ وہ ان میں سے نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کا دل غیر اللہ کے ساتھ ہمہ وقت مشغول رہتا ہے، دل کی غفلت کے باوجود ظاہری خشوع دکھاتا ہے، عبادات بغیر حضورِ قلب کے انجام دیتا ہے، زبان تروتازہ نظر آئے گی لیکن اس کا دل ویران ہوگا۔ نعوذ باللہ من ذلک

تصنّع سے باز رہیں

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ مردار کی طرح اپنی ہیئت

بنائے ہوے ہے، تولوگوں سے دریافت کیا کہ اسے کیا ہوگیا ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ صالح اور درویش آدمی ہے۔ یہ سن کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کسی اور کو اپنی رحمت سے دور نہ کرے، حضرت عمرؓ اس سے زیادہ صالح اور نیک انسان تھے، لیکن جب چلتے تھے تو پھرتی کے ساتھ، جب کسی پر ڈنڈا برساتے تھے تو اس طرح کہ محسوس بھی ہو، جب کسی کو کھلاتے تھے تو پیٹ بھر کر کھلاتے تھے، لہٰذا تم لوگ تصنّع (دِکھاوا) چھوڑو، کیوں کہ تصنّع باز شخص کا کوئی عمل اللہ قبول نہیں کرتا"۔

ریاکاری، دراصل دل کی بیماریوں، نفس کی شرارتوں اور شیطان کی چالوں میں سے ایک ہے، جس میں اہل علم، عبادت گزار، اہل ثروت اور اہل صلاح وتقویٰ مبتلا ہوجاتے ہیں، ریاء کے ذریعہ انسان کا نفس مجاہدے کی مشقت سے چھٹکارا حاصل کرکے مخلوق کی نگاہ میں مقبولیت کی لذت حاصل کرنا چاہتا ہے، گویا کہ اس کو یہ یقین نہیں ہے کہ خالق کائنات اس کی ہر نقل وحرکت سے واقف ہے، وہ ان وسوسوں سے بھی واقف ہے جو اس کے نفس میں پیدا ہوتے ہیں، لوگوں کی مدح وثنا پر قناعت کرکے اپنے مولی کی خوش نودی کے حصول سے غافل ہوگیا، یہی وجہ ہے کہ ریاء کاری میں عام طور پر وہی لوگ مبتلا ہوتے ہیں جن کی دین داری میں پختگی نہیں ہوتی۔

مقبولیت، اخلاص کا نتیجہ ہے

ریاکار کی محبت وقبولیت لوگوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوتی، مقبولیت اور محبت، حقیقت میں اخلاص واحسان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ریاکار شخص لوگوں سے کیا چاہتا

ہے؟ لوگوں کی مدح وثناء کے پیچھے کیوں پڑا رہتا ہے؟ کیا اسے پتہ نہیں کہ لوگوں کے قلوب ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں، بلکہ رحمن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، انہیں جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔

حافظ ابن الجوزیؒ کہتے ہیں کہ:

"میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو کثرت سے روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، صدقات وخیرات کرتے تھے اور اپنی وضع قطع اور لباس سے خشوع وخضوع ظاہر کرتے تھے، لیکن لوگوں کے دل ان کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان سے بدکتے تھے اور ان کا اعزاز واکرام نہیں کرتے تھے، جب کہ ایسے لوگ بھی دیکھے جو ان سے عبادت وریاضت میں کم تر تھے؛ لیکن لوگ بے تحاشا ان سے محبت کرنے لگے اور ان کے دل، ان کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے۔

لہٰذا جو شخص اپنے اندرون کی اصلاح کرے گا، اس کے فضل وکمال کی خوش بو پھوٹتی چلی جائے گی اور اس کی خوبیاں خود ہی منظر عام پر آنے لگیں گی، لہٰذا اللہ کا خوف کرو اپنے باطن کے سلسلے میں، کیوں کہ اگر باطن خراب ہے، تو ظاہری صلاح کام نہیں دے گا"۔

خالق کی رضا کو اپنا نصب العین بنائیں

لوگوں کے دلوں میں کسی کی قدر ومنزلت اسی وقت گھر کرتی ہے جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، لہٰذا اگر اللہ نہ چاہیں تو ریاکاری کے ذریعہ آپ اپنا وقت، اپنی صلاحیت اور اپنا مال سب ضائع کردیں گے، لیکن دلوں میں محبت پیدا نہیں ہوگی، بلکہ عین ممکن ہے کہ اللہ

تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوجائے، ریاکاری کے ذریعے اللہ کو ناراض کر کے مخلوق کو راضی کرنے اور ان کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرنے کا مطلب ہے کہ اللہ کی توفیق سلب ہوگئی ہے اور وہ شخص نورِ بصیرت سے محروم ہوگیا ہے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی امید وخوف کا محور صرف اپنے خالق ومالک کو بنائیں، لوگوں سے بے نیاز ہوجائیں:

﴿أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾﴾

[التوبة: ١٣]

''کیا تم ان (لوگوں) سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو''۔[سورۂ توبہ:۱۳]

سارے کے سارے انسان، رب کائنات کے سامنے کمزور، بے بس، ذلیل اور عاجز ہیں، ان کی پیشانیاں، اسی کے دستِ قدرت میں ہیں، ان پر مکمل حکمرانی اسی کی ہے، ساری دنیا مل کر بھی کسی خدائی فیصلے کو ٹال نہیں سکتی، نہ کسی کے لیے روزی مہیا کر سکتی ہے، نہ ہی کسی ناگہانی آفت کا رخ موڑ سکتی ہے۔

جو شخص خالق کو ناراض کر کے، مخلوق کی رضا کا طالب ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کے اور اپنے فضل کے درمیان حجاب قائم فرما کر اسے اسی کے نفس کے حوالے فرمادیں گے، جو شخص اپنے اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ درست کرے گا اور اپنے اور خالق کے مابین معاملات بگاڑ لے گا، تو نہ صرف یہ کہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے گا، بلکہ اس کے برعکس نتیجہ دیکھے گا اور لوگ اس کی مدح وثنا کے بہ جائے اس کی مذمت کریں گے۔

«وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَا النَّاسِ بِسَخَطِ اللهِ، سَخَطَ اللهُ

عَلَيْهِ، وَأَسْخَطَ عَلَيْهِ النَّاسَ» [الترغيب والترهيب والترمذي]

”جو شخص اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضا ڈھونڈھے گا، اللہ اس سے ناراض ہو گا اور لوگوں کو بھی اس سے ناراض کرے گا“۔

[الترغیب والترہیب، والترمذی]

لہٰذا اس صورت میں ریاکار شخص نہ دین کا رہا نہ دنیا کا۔ مشقت بلا فائدہ، اور عمل بغیر اجر و ثواب۔ تمام شرکاء میں اللہ تعالیٰ شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہیں، دکھاوے کا عمل کرنے والا دراصل اپنی نیت میں کسی اور کو شریک کرتا ہے۔

ریاکار، دھوکہ باز ہے

جو شخص لوگوں کے سامنے، مخلص اور محسن کا روپ دھار لیتا ہے، اپنے عمل کو خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے، ظاہری خشوع و خضوع کا رنگ اس پر چڑھاتا ہے، لیکن جب تنہائی میں ہوتا ہے تو جیسے تیسے عمل کر کے گویا کہ سر سے بوجھ اتار پھینکتا ہے، ایسا شخص دھوکہ باز ہے، لیکن دھوکہ بھی کسے دے رہا ہے؟ یہ اللہ جل جلالہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کو نہیں، بلکہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔

﴿يُخَادِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝٩﴾ [البقرة: ٩]

”وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو واقعی ایمان لا چکے ہیں، دھوکہ دیتے ہیں۔ اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) وہ اپنے سوا کسی اور کو دھوکہ نہیں دے رہے ہیں، لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے“۔ [سورۂ بقرۃ:۹]

منافقوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ ٱلۡمُنَٰفِقِينَ يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَهُوَ خَٰدِعُهُمۡ وَإِذَا قَامُوٓاْ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ قَامُواْ كُسَالَىٰ يُرَآءُونَ ٱلنَّاسَ وَلَا يَذۡكُرُونَ ٱللَّهَ إِلَّا قَلِيلٗا ١٤٢﴾ [النساء: ١٤٢]

”یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہیں، حالاں کہ اللہ نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اور جب یہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو برائے نام ہی یاد کرتے ہیں“۔ [سورۂ نساء: ۱۴۲]

حسنِ نیت اور اخلاصِ عمل فرض ہے، جس انسان کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ درست ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ مخلوق کے ساتھ اس کے معاملے کو درست فرمادیں گے، جو شخص اپنے باطن کے اعتبار سے سچا ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو سدھار دیتے ہیں اور جو شخص آخرت کے لیے عمل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اپنے ذمے لے کر اس کی ضروریات کی تکمیل فرمادیتے ہیں۔

اخلاصِ باطن اور صدق دلی کے سلسلے میں اللہ سے ڈرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ حساب وکتاب لینے والا باخبر ہے، سزا وجزا میں کوئی رو رعایت نہیں، عادل حاکم کسی کی طرف داری نہیں کرتا، بدلہ دینے میں کسی طرح کا ظلم روا نہیں رکھتا، وہ ”حفیظ“ ہے، کوئی عمل اس کے یہاں ضائع نہیں ہوتا، سب محفوظ رہتا ہے۔

جو انسان، ہوا پرستی کی غلامی سے آزاد ہوجاتا ہے اور اسبابِ ریا ونمود سے پاک ہوجاتا ہے، وہی طریقِ اخلاص کا راہی بنتا ہے، ایمان کے بیش بہا سرمایے کو لے کر، احکامِ

اسلامی کے آداب کی رعایت کرتے ہوے، اس کی خوب صورت تعلیمات وہدایات کو سینے سے لگاتے ہوے، اللہ کے اوامر پر عمل کرتے ہوے، اس کے نواہی سے بچتے ہوے، اس کے حدود کی پاسداری کر کے، قضاوقدر کے فیصلے پر راضی رہ کر، کثرتِ ذکر و شکر کے ساتھ، اس کے فیصلوں پر اعتراض کیے بغیر "سلیم القلب" ہوکر اپنے رب کے ساتھ صدق واخلاص کا معاملہ کرتا ہے۔

جس شخص کا ہر عمل اخلاصِ نیت کے ساتھ ہوگا، حسنِ عمل اور حسنِ نیت دونوں کو باہم جمع کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا، اپنا قرب عنایت کرے گا، مخلوق کے شر سے اس کی حفاظت کرے گا۔

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾﴾

[الأنعام: ١٦٢ – ١٦٣]

"کہہ دو کہ بے شک میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور میں اس کے آگے سب سے پہلے سر جھکانے والا ہوں"۔ [سورۂ انعام: ۱۶۲-۱۶۳]

ریاء کے خوف سے ترکِ عمل

ریاء اور اس کے نقصانات اوپر ذکر کر کیے گئے، بلاشبہ یہ محنت ومشقت اور اعمال کو ضائع کرنے والی ہے؛ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ ریاء کے خوف سے سرے سے عمل کرنا ہی

چھوڑ دیا جائے، یا ریاء کے اندیشے سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوجائیں اور وسوسے کا شکار ہوجائیں، کیوں کہ یہ اندیشہ، شیطانی مداخلت کی راہ ہموار کرتا ہے، کارِ خیر سے روکتا ہے، اس طرح کے اندیشے کی وجہ سے عمل ترک کرنا، دراصل شیطان کی پیروی کرنا ہے، لہٰذا عمل کو جاری رکھیں اور مجاہدۂ نفس کے ذریعہ اخلاصِ نیت پیدا کرنے کی کوشش کریں، ہر انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے اور اس کو اخلاص کی ڈگر پر لانے کی کوشش کرتا رہے، پیہم مجاہدے کی وجہ سے ان شاء اللہ اخلاص پیدا ہوجائے گا، پھر عمل، صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہی ہوگا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے تھے:

”لوگوں کی وجہ سے عمل صالح کرنا شرک ہے، اور لوگوں کی وجہ سے عمل ترک کردینا ریاء ہے، اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان دونوں بیماریوں سے محفوظ رکھے“۔

بعض سلف صالحین کہتے تھے:

”جس نے اخلاص کے فقدان کی وجہ سے عمل کرنا چھوڑ دیا، اس نے دو کام چھوڑ دیے، اخلاص بھی چھوڑا اور عمل بھی“۔

بلکہ اگر نیت صحیح ہو اور عمل موافقِ شرع ہو تو اس عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والے دنیوی منافع سے شریعت نہیں روکتی، نہ ان کو حاصل کرنے کی وجہ سے عمل پہ کوئی اثر مرتب ہوتا ہے، چناں چہ اخلاصِ نیت کے ساتھ اگر کوئی حج کرتا ہے، تو تجارت کے ذریعہ حلال مال کی کمائی اس کے حج کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگی، ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَن تَبۡتَغُواْ فَضۡلٗا مِّن

رَبِّكُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۸]

”تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو“۔[سورۂ بقرۃ:۱۹۸]

اسی طرح کوئی شخص طہارت کے لیے وضو کرے اور ٹھنڈے پانی سے لطف اندوز بھی ہو تو طہارت پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا، نیز کوئی شخص علمِ شریعت اس لیے طلب کرے کہ اپنی اور دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بنے گا، تو اس میں کوئی حرج نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ریاء کی بیماری سے چھٹکارا حاصل کرنے کا راستہ یہ نہیں ہے کہ عمل ہی کو ترک کر دیا جائے، بالخصوص ایسے اعمال جن کی ادائیگی اعلانیہ طور پر ہی ہو سکتی ہے، انہیں چھپانا ممکن نہیں، مثال کے طور پر: نماز باجماعت، جہاد فی سبیل اللہ اور حصولِ علم وغیرہ۔

لیکن اگر عمل ایسا ہے جس کی ادائیگی اعلانیہ طور پر ضروری نہیں ہے، تو اس عمل کو پوشیدہ طور پر انجام دینا چاہیے، تاکہ ریاء کا اندیشہ نہ رہے، البتہ اگر ریاء سے محفوظ ہو، حسنِ نیت اور اخلاصِ نیت موجود ہو تو پھر دوسروں کی حوصلہ افزائی اور ان کو عمل پر آمادہ کرنے کے لیے اعلانیہ طور پر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ صدقات کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿إِن تُبْدُوا ٱلصَّدَقَٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا ٱلْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّـَٔاتِكُمْ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾﴾ [البقرة: ۲۷۱]

”اگر تم صدقات کو ظاہر کر کے دو تب بھی اچھا ہے، اور اگر ان کو چھپا کر

فقراء کو دو تو یہ تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا، اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے"۔

[سورۂ بقرۃ:۲۷۱]

فوری بشارت

جب کوئی مومن اخلاصِ نیت کے ساتھ عمل کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی رضا اسے حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ اخلاص کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور اگر اخلاص ہو تو نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں؛ بلکہ اس مومن کے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتے ہیں، لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، معاشرے میں اس کی نیک نامی اور حسنِ سیرت کی شہرت ہوجاتی ہے، لہٰذا اس طرح کی نیک نامی اور شہرت اور لوگوں کی تعریف کو اللہ کا انعام سمجھنا چاہیے، اگر اس کی تعریف کی جاتی ہے تو اس کی وجہ سے اس کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، نہ اس کے عمل پر کوئی اثر پڑے گا۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا:

«أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَيْرِ وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ؟ قَالَ: تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ». [رواه مسلم]

"آپ کا کیا خیال ہے کہ آدمی خیر کے کام کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: "یہ مومن کی فوری بشارت ہے"۔

[مسلم شریف]

یعنی اگر وہ مخلص ہے تو آخرت کا اجر وثواب تو اس کے لیے ہے ہی، ساتھ ہی

ساتھ دنیا میں بھی اس کے لیے نیک نامی اور مقبولیت مقدر ہوجاتی ہے، لوگ اس کو اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اس کی تعریف کرتے ہیں، یہی «بشری عاجلہ» یعنی فوری بشارت ہے۔

❊ ❊ ❊

۱۱/رجب/۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی شخصیت کے تین بنیادی عناصر

اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کے اندر تین طرح کے طاقت ور عناصر جمع ہوں: جسمانی قوت، فکری بلندی اور روحانی طاقت؛ لہٰذا جس شخص کے اندر یہ تین بنیادی عناصر جمع ہوں تو وہ اپنے درخشاں مستقبل کی عمارت ان مضبوط اور طاقت ور بنیادوں پر پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی کر سکتا ہے، جس کے اندر یہ تین اہم عناصر اکٹھے ہوں ان شاء اللہ وہ نہایت وثوق اور بصیرت کے ساتھ اپنے دین، وطن اور معاشرے کی خدمت کر سکتا ہے۔

جسمانی قوت

ان تینوں عناصر کا پہلا جزو ہے "جسمانی قوت" جس سے مراد ہے صحت وعافیت اور تندرستی، یہ ان تین امور میں سے ہے جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ چیزیں کسی کو مل گئیں تو گویا کہ پوری دنیا کی دولت مل گئی۔

«مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِناً فِي سِرْبِهِ مُعَافًى فِي جَسَدِهِ عِنْدَهُ

قُوتُ يَوْمِهِ فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا».

[رواه الترمذي والبخاري في الأدب المفرد]

”تم میں سے جس شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ امن سے ہو، جسمانی لحاظ سے تندرست ہو اور اس کے پاس دن بھر کی روزی موجود ہو، تو گویا کہ پوری دنیا سمیٹ کر اس کے دامن میں رکھ دی گئی ہو“۔

[ترمذی وبخاری فی الادب المفرد]

جسمانی عافیت اور صحت وتن درستی ایسی چیز ہے جس کے بغیر انسان چین وسکون کی زندگی نہیں گزار سکتا، اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے دعا فرماتے تھے، نیز حضراتِ صحابۂ کرامؓ کو بھی یہ تعلیم دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کیا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«سَلُوا اللهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فَإِنَّ أَحَدًا لَمْ يُعْطَ بَعْدَ الْيَقِينِ خَيْرًا مِنَ الْعَافِيَةِ». [رواه الترمذي]

”تم اللہ تعالیٰ سے معافی اور عافیت طلب کیا کرو، کیوں کہ کسی شخص کو یقین کے بعد عافیت سے اچھی چیز عنایت نہیں کی گئی“۔ [ترمذی شریف]

حضرت حسن بن علیؓ کو حضور ﷺ نے جو دعائے وتر سکھائی تھی اس میں بھی عافیت کی دعا مانگی گئی ہے:

«وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ». [مسند أحمد] ”اے اللہ! جنہیں آپ نے عافیت دی ہے ان میں مجھے بھی شامل فرمالیجیے“۔ [مسند احمد]

اسی طرح دو سجدوں کے درمیان بھی حضور ﷺ سے دعا کے چند کلمات ثابت

ہیں، جن میں ایک لفظ ہے "وعافنی" "یعنی اے اللہ مجھے عافیت نصیب فرما"۔[ابوداؤد شریف]

اسلام نے تن درستی اور حفظانِ صحت کا پورا پورا خیال رکھا ہے، جسم کے ساتھ ناروا سلوک کرنے اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالنے سے منع کیا ہے، اسی لیے زبانِ نبوت سے یہ مبارک الفاظ نکلے ہیں:

«فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا». [صحيح البخاري]

"کیوں کہ تمہارے جسم کا بھی تمہارے اوپر حق ہے"۔[بخاری شریف]

اس حق کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ بقدر ضرورت اسے راحت پہنچائی جائے، جب نیند کا غلبہ ہو تو سو جائے، بھوک لگے تو کھانا کھائے، پیاس لگے تو پانی پیے، جسم گندہ ہو جائے تو صفائی کا اہتمام کرے، بیمار ہو جائے تو علاج کرائے اور تھک جائے تو آرام کرے۔

اسلام، ایک طاقت ور امت دیکھنا چاہتا ہے، کوئی امت یا قوم طاقت ور تب ہی ہو سکتی ہے، جب اس کے افراد طاقت ور اور تندرست ہوں، کیوں کہ افراد سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے:

«الْعَقْلُ السَّلِيمُ فِي الْجِسْمِ السَّلِيمِ». "صحت مند عقل، صحت مند جسم میں ہوتی ہے"۔

جسمانی صحت کی بربادی کے اسباب اور ان کی حرمت

صحت ایک عظیم نعمت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے، اس کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، یہ صرف نعمت ہی نہیں، بلکہ اللہ کی امانت بھی ہے، اس پر

زیادتی کرنے کا مطلب ہے امانت میں خیانت، لہٰذا ہر وہ چیز جو صحت کی خرابی کا باعث بنے اس سے پرہیز ضروری ہے، اسی لیے اسلام نے خودکشی کو بھی حرام قرار دیا اور خود کو ہلاکت میں ڈالنے سے بھی منع کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾﴾

[النساء: ٢٩]

"اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقیناً اللہ تم پر بہت مہربان ہے"۔

[سورۂ نساء:۲۹]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُلْقُواْ بِأَيْدِيكُمْ إِلَى ٱلتَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٩٥﴾﴾ [البقرة: ١٩٥]

"اور اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی اختیار کرو۔ بیشک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔ [سورۂ بقرۃ:۱۹۵]

اسی وجہ سے اسلام نے نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیا خواہ وہ کسی قسم کی ہوں، کیوں کہ ان سے انسانی صحت پر بدترین اثر پڑتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ، فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ».

[رواه أحمد وصححه ابن حبان]

"جس چیز کا زیادہ مقدار میں استعمال کرنا نشہ آور ہو اس کا تھوڑا بھی حرام ہے"۔ [احمد وصححہ ابن حبان]

سگریٹ نوشی سے بھی اسلام منع کرتا ہے، کیوں کہ وہ بھی صحت کے لیے سخت

مضر ہے، تمام طبی تحقیقات اور انسانی تجربات اس کے شاہد ہیں کہ سگریٹ نوشی کسی حال میں بھی صحت کے لیے مفید نہیں ہے، بلکہ صحت کو اور بالخصوص پھیپھڑوں کو تباہ و برباد کرنے والی چیز ہے۔

جسمانی صحت کے بغیر عبادات کی ادائیگی بھی مشکل

اگر جسمانی صحت وعافیت اور اعضاء وجوارح کی طاقت انسان کھو بیٹھے تو نہ دنیوی ذمہ داریاں پوری کر سکے گا نہ دینی فرائض وواجبات کی تکمیل کر سکے گا، چناں چہ نماز کے لیے مسجد جانا، نماز ادا کرنا، روزے رکھنا، حج کرنا جس میں طوافِ کعبہ، صفا ومروہ کی سعی کرنا، جمرات کی رمی کرنا اور مشاعرِ مقدسہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہے ـــــ ان تمام صورتوں میں جسمانی صحت درکار ہے، جب ہی یہ کام آسانی سے ہو پائیں گے، اسی طرح اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد فی سبیل اللہ، اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت اور دشمن کا مقابلہ بھی جسمانی قوت اور تن درستی کے بغیر مشکل ہے؛ بلکہ رزقِ حلال کے لیے تگ ودو کرنا اور اس کے حصول کے لیے مختلف وسائل وذرائع کو بروئے کار لانا بھی محنت طلب اور جسمانی صحت وعافیت کا متقاضی ہے ـــــ اگر خود محنت کرکے حلال روزی نہیں کمائے گا تو دوسروں پر بوجھ بنے گا؛ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑے جو اسلام میں ایک ناپسندیدہ عمل ہے، تن درستی اگر برقرار ہے تو محنت ومشقت کے ذریعے حلال روزی کما کر عزتِ نفس اور خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرے گا، ورنہ سوال کرکے ذلیل وخوار ہوگا۔

عام طور پر صحابۂ کرامؓ شہ سواری اور تیر اندازی میں مہارت رکھتے تھے، بلکہ اپنے

بچوں کو بھی اس کی مشق کراتے تھے — حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ سر جھکا کر نہایت کمزور اور بیمار کی طرح چل رہا ہے، تو سختی سے اسے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ”سر اٹھا کے چل، خشوع و خضوع دل میں ہوتا ہے، گردن میں نہیں“۔

حضرت عائشہؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ بیمار اور بوڑھے کی طرح چل رہا ہے، تو انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے اور ایسا حال کیوں بنا رکھا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ زاہد و عابد شخص ہے، یہ سن کر انہوں نے فرمایا:

”حضرت عمرؓ بھی بڑے زاہد و عابد تھے؛ لیکن ان کا حال یہ تھا کہ جب چلتے تو نہایت پھرتی کے ساتھ تیز چلتے، جب بات کرتے تو سب کو ان کی بات سنائی دیتی تھی، اور جب کسی کی پٹائی کرتے تو اس طرح سے کہ محسوس بھی ہو“۔

طاقت ور مومن بہتر ہے کم زور مومن سے

اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر ایمان والا توانا، تن درست اور چست و پھرتیلا ہو، بسیار خوری کے ذریعے مُٹاپے کو پسند نہیں کرتا، اسی طرح لاپرواہی کر کے صحت خراب کرنے سے بھی منع کرتا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان حفظانِ صحت کے اصولوں پر کاربند ہو اور صحت مند جسم کے ساتھ زندگی گزارے، اسی لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ». [رواه مسلم]

”طاقت ور مومن بہتر اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے بہ نسبت کم زور مومن

کے اور ہر مومن میں خیر ہے"۔[مسلم شریف]

پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ "دوامِ حال محال" ہے، یعنی حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، اس لیے خود کو آرام طلب اور راحت پسند نہیں بنانا چاہیے، بقدر استطاعت صحت مند غذاؤں کے ساتھ ساتھ ورزش وغیرہ کا اہتمام بھی کرنا چاہیے، کیوں کہ زیادہ آرام پسندی کی زندگی گزارنے کے بعد خدانخواستہ حالات بدل گئے تو بڑی دشواری پیش آسکتی ہے، ویسے بھی انسان کی زندگی میں مد و جزر اور اتار چڑھاؤ آتا ہی رہتا ہے، گلاب کے خوب صورت اور خوش بودار پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں، زندگی صرف حسین خوابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ یہاں مصائب وآلام سے بھی گزرنا پڑتا ہے جو زندگی کا جزو ہیں، یہاں موسم بہار بھی آتا ہے اور زلزلہ اور سیلاب بھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جسم کو راحت پسند بناکر کمزور کرنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ اسلام میں تن درستی اور جسمانی قوت وتوانائی مطلوب ہے۔

اسلامی شخصیت کا دوسرا بنیادی عنصر

ایک کامیاب مسلمان شخصیت کا دوسرا ضروری اور بنیادی عنصر "عقلِ سلیم" اور فکر سلیم ہے، سوچ اور فکر کی طاقت ایک ایسا مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کے بغیر نہ کوئی فرد ترقی کرسکتا ہے نہ کوئی معاشرہ۔

ہم جس عقلِ قوی اور فکر سلیم کی بات کررہے ہیں اس کے لیے سب سے پہلے "فکر" کا وجود ضروری ہے، کیوں کہ فکرِ سلیم تو دوسرا مرحلہ ہے، اس سے پہلے خود فکر کا ہونا ضروری ہے، ورنہ بعض لوگ اپنی عقل کو اس کے محفوظ خانے میں ہی محفوظ رکھتے ہیں، ذرا

بھی اسے حرکت نہیں دیتے، اپنی فکری صلاحیت کو منجمد کرکے اسے ناکارہ بنادیتے ہیں اور ہر چیز میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں، یہاں تک کہ جنہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور وہ دشمن ہوتے بھی ہیں، ان کی بھی تقلید کرتے ہیں، ان کے عادات واطوار کو اپناتے ہیں ان کے طرزِ لباس اور فیشن اختیار کرکے فخر بھی کرتے ہیں، بلکہ اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں ان ہی کی نقل کرتے ہیں۔

لیکن جو شخص اپنی فکر ونظر کو اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے، بلند سوچ رکھتا ہے، سنجیدہ اور مثبت سوچ کے ذریعے صحیح نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ہر ایک کی پیروی میں نہیں لگتا، طوطے کی طرح دوسروں کی نقل نہیں کرتا، گھٹیا اور اخلاق سوز حرکتیں کرنے والوں کو اپنا مقتدا اور امام نہیں بناتا، اس کی فکر وذوق کا معیار، اتنا بلند ہوتا ہے کہ مخلوقات میں افضل ترین ہستی کے سوا کسی کو اپنا آئیڈیل نہیں سمجھتا، اسی طرح کسی مخلوق کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا، اس کی عقلِ سلیم اس کو گوارا نہیں کرتی کہ جانوروں کی طرح بے مقصد زندگی گزارے یا کسی مخلوق کی پرستش کرنے لگے، وہ اپنے وجود کے بارے میں بھی سوچتا ہے کہ اس کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ کیوں اسے پیدا کیا گیا ہے؟

﴿ أَمْ خُلِقُوا۟ مِنْ غَيْرِ شَىْءٍ أَمْ هُمُ ٱلْخَـٰلِقُونَ ﴿٣٥﴾ ﴾

[الطور: ٣٥]

”کیا یہ لوگ بغیر کسی (پیدا کرنے والے) کے خود بخود پید ہوگئے، یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟“۔[سورۂ طور:۳۵]

وہ اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرتا ہے، اپنے انجام کو سامنے رکھتا ہے، آخرت کی فکر میں اس کی تیاری بھی کرتا ہے، آخرت کی کامیابی کے لیے اپنے عقیدے اور عمل کا

محاسبہ کرتا ہے، اپنا جائزہ لیتا ہے کہ زندگی کس رُخ پر جارہی ہے، آخرت میں کام آنے والے اور نیکیوں کا پلڑا بھاری کرنے والے اعمال کا ذخیرہ کتنا ہے؟

فکرِ سلیم کا حامل شخص زمین و آسمان کی تخلیق پر بھی غور کرتا ہے، اس کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی بے شمار نشانیوں پر گہری نظر ڈالتا ہے، پھر بے ساختہ اس کی زبان سے یہ کلمات نکلتے ہیں کہ ہمارے رب نے انھیں بلاوجہ اور بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے، اس طرح اس کا ایمان ویقین مزید پختہ ہوتا چلا جاتا ہے، ان "عقل مندوں" کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَٰفِ ٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ لَءَايَٰتٍ لِّأُو۟لِى ٱلْأَلْبَٰبِ ﴿١٩٠﴾ ٱلَّذِينَ يَذْكُرُونَ ٱللَّهَ قِيَٰمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَٰطِلًا سُبْحَٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿١٩١﴾﴾

[آل عمران: ۱۹۰ – ۱۹۱]

"بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، (اور انہیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے"۔ [سورۂ آلِ عمران: ۱۹۰-۱۹۱]

دارین کی کامیابی کی فکر

اسلام، ہر ایک سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی فکر و نظر کو دنیا اور آخرت کی سعادت کے لیے استعمال کرے، فکرِ آخرت غالب رہے کہ ہمیشہ وہیں رہنا ہے، تاہم فکرِ دنیا سے بھی بے بہرہ نہ ہو۔

﴿وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ ٱلدُّنْيَا﴾ [القصص: ۷۷]

”اور دنیا میں سے بھی اپنے حصے کو نظر انداز مت کرو“۔ [سورۂ قصص: ۷۷]

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان ”صاحب الید العلیا“ ہو، یعنی اس کا ہاتھ اوپر رہے، نیچے نہ رہے، یعنی دینے والا بنے، نہ کہ لینے والا، اور اس کے لیے اپنی فکر و نظر کو بروئے کار لاکر جد و جہد کے ذریعے اپنی معاشی صورتِ حال مضبوط بنانا ہوگی، مسلمان سے یہ مطلوب ہے کہ اپنی فکری، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو استعمال کرکے نئی ایجادات اور اختراعات امت کے سامنے پیش کرے اور جدید ترین مصنوعات کے لیے اونچے معیار کے کارخانے قائم کرے، اعلیٰ ترین مصنوعات کے ذریعے عالمی منڈی میں اپنی پُروقار حیثیت پیدا کرے، تاکہ ہم صرف ”درآمد“ کرنے والی قوم کے بہ جائے ”برآمد“ کرنے والی قوم بن سکیں۔ جس قوم کے نوجوانوں میں یہ سوچ و فکر پیدا ہوجائے وہ قوم اپنی اقتصادی اور معاشی طاقت کے ذریعے، اسی طرح سیاسی سوجھ بوجھ اور قائدانہ فکر و نظر اور کردار کے ذریعے دوسروں کی تابعداری اور نازبرداری کے بہ جائے خود اپنا مقام بنا سکتی ہے، بلکہ اپنے دیرپا منصوبوں اور فکری اور سیاسی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر، انٹرنیشنل قائدانہ کردار ادا کرسکتی ہے۔

اسلامی شخصیت کا تیسرا عنصر: روحانی قوت

مذکورہ جسمانی اور فکری قوتوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا عنصر بھی ہے جس سے اسلامی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے، وہ ہے روحانی قوت؛ کیوں کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے؛ بلکہ جسم اور روح دو چیزوں سے انسان وجود میں آتا ہے، جس طرح جسم کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح روح کو بھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے، جسم کو اس کی غذا مہیا نہ کی جائے تو کم زور ہوجاتا ہے، اسی طرح روح کو بھی اس کی غذا نہ پہنچائی جائے تو نہ صرف کم زور ہوجاتی ہے، بلکہ مُردار ہوجاتی ہے۔

روح کی غذا اللہ کا ذکر ہے، نماز ہے، تلاوتِ قرآنِ پاک ہے، تسبیح، تہلیل اور تکبیر ہے؛ لہٰذا جس طرا انسان اپنی جسمانی طاقت بہ حال کرنے اور اُسے برقرار رکھنے کے لیے اس کی غذا لیتا ہے، اسی طرح روحانی طاقت بہ حال کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کے لیے بھی غذا لینی چاہیے، بلکہ جسم سے زیادہ روح کی غذا کی فکر ہونی چاہیے؛ کیوں کہ انسان کی اصل روح ہے، حقیقی زندگی روحانی زندگی ہے، اسی لیے روح اگر نکل جائے تو جسم کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی ہے، اسے لاش سے تعبیر کرتے ہیں، یا جنازہ کہتے ہیں، اسی روح سے قلب کی حرکت بھی برقرار رہتی ہے، گویا کہ قلب میں اگر حرکت ہے تو روح بھی باقی ہے، اسی لیے اس قلب کی تسکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے ذکر کو ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَتَطۡمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكۡرِ ٱللَّهِۗ أَلَا بِذِكۡرِ ٱللَّهِ تَطۡمَئِنُّ ٱلۡقُلُوبُ ﴿٢٨﴾ ﴾ [الرعد: ۲۸]

”یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں، اور جن کے دل، اللہ کے ذکر سے

اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو، اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو تسلی نصیب ہوتی ہے"۔[سورۂ رعد:۲۸]

جو چیز اس قلبی اور روحانی کیفیات اور سکون واطمینان کو تباہ وبرباد کردیتی ہے، وہ معصیت ہے، گناہوں کی کثرت کی وجہ سے یہ قلب بالکل سیاہ ہوجاتا ہے، قرآنِ کریم نے کہا:

﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾ ﴾ [المطففين: ١٤]

"ہرگز نہیں! بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں، اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے"۔[سورۂ مطففین:۱۴]

طاعات کی کثرت کی وجہ سے یہ روح طاقت ور بنتی ہے، پھر جس شخص کو روحانی طاقت میسر ہوجاتی ہے، وہ صبر وشکر کے اعلیٰ مقام کو پالیتا ہے، اسی طاقت کی وجہ سے اس کے اندر بہادری اور دلیری پیدا ہوتی ہے اور وہ اللہ کے لیے اپنی جان تک دینے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی مسلمان کے اندر یہ تینوں طاقتیں اکٹھی ہوجاتی ہیں تو اس کی شخصیت قابلِ رشک ہوتی ہے، وہ دوسروں کے لیے نمونہ بن جاتا ہے؛ بلکہ دونوں جہاں کی بھلائیاں اپنے اندر سمولیتا ہے۔

* * *

۱۴۴۱/۵/۱۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خوش نصیب اور بد نصیب

روز مرہ کے جو الفاظ عام طور پر زبان زد ہیں، ان میں سے ایک لفظ ہے ''خوش قسمت'' ''نصیب والا''۔ کہا جاتا ہے: فلاں شخص خوش نصیب ہے، یا اس کی قسمت بڑی اچھی ہے وغیرہ، اس طرح کے الفاظ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ بتلایا جائے کہ فلاں شخص کو اس کی مرادیں مل گئیں، اس کی آروزئیں پوری ہوگئیں، ایسی چیزوں سے وہ بہرہ مند ہوگیا ہے جن کی لوگ آروز کرتے ہیں یا ان پر رشک کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ لفظ بھی زبان زد ہے: ''فلاں شخص محروم'' ہے، یا بدقسمت ہے، بدنصیب ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص ناکام ونامراد ہے، اپنی آرزوئیں پوری نہیں کرسکا، اس کی کوششوں کا نتیجہ ہمیشہ اس کی چاہت اور خواہش کے خلاف نکلتا رہا۔

''نصیب'' کی حقیقت کیا ہے؟

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ نصیب اور قسمت، انسانی زندی سے واقعی وابستہ ہیں، انسان حقیقت میں بانصیب ہوتا ہے، خوش قسمت ہوتا ہے۔ جب ہم کسی کے لیے

"صاحب حظ" یعنی نصیب ور یا خوش قسمت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خیر و بھلائی اور انعامات و فیوض سے نوازا ہے، اللہ نے اپنی توفیق سے اس کی قسمت چمکائی ہے، اس پہ انعامات کی بارش برسائی ہے، اگر اللہ نہ چاہے تو یہ خوش قسمتی، بدقسمتی میں بدل جائے گی۔

خوش قسمت انسان کون ہے؟

خوش قسمت اور نصیبے والا شخص کون ہے؟ عام طور پر اس کو سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے؛ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قسمت والا وہ ہے جو مال و دولت کی فراوانی اور جاہ و منصب کی بلندی سے ہم کنار ہو، یا اس کے تعلقات، وزراء، امراء اور وجہاء سے ہوں، یا اس کے پاس ہر طرح کے وسائل راحت وآرام موجود ہوں اور حشم و خدم اس کے اشارے کے انتظار میں رہتے ہوں، وغیرہ۔

لیکن حقیقی خوش بخت اور بانصیب وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم وبصیرت کے ساتھ اپنی اطاعت کی توفیق دی ہو، جس کے دل میں خوفِ خدا ہو اور اپنے ہر قول وفعل اور نیت وارادے میں صرف اللہ کی رضا کا متلاشی ہو، اس کے سارے معاملات، خواہ خفیہ ہوں یا اعلانیہ ہوں سب یکساں ہوں، کسی میں نمائش اور ریا نہ ہو۔

حقیقی خوش قسمت وہ شخص ہے جسے علم الیقین حاصل ہو کہ اس کی عزت وشرافت صرف طاعتِ الٰہی، اس کی شریعت کی اتباع، اس کے احکام کی پابندی اور زندگی کے تمام شعبوں میں دینِ حنیف کو نافذ کرنے میں مُضمَر ہے۔

﴿وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾﴾

[الأحزاب: ٧١]

”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اس نے بڑی کامیابی حاصل کرلی“۔[سورۂ احزاب:۷۱]

حقیقی سعادت مند وہ شخص ہے جو برائی کا بدلہ بھلائی سے دے، کوئی محروم کرے تو اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے، کیوں کہ یہ شیطان کے مکر وفریب اور عداوتوں اور رنجشوں کو دفع کرنے کا، بلکہ دلوں کے اوپر حکمرانی کرنے کا عظیم باب ہے، ارشادِالٰہی ہے:

﴿ٱدۡفَعۡ بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ فَإِذَا ٱلَّذِي بَيۡنَكَ وَبَيۡنَهُۥ عَدَٰوَةٞ كَأَنَّهُۥ وَلِيٌّ حَمِيمٞ ﴿٣٤﴾﴾ [فصلت: ٣٤]

”تم بدی کا دفاع ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو، نتیجہ یہ ہوگا کہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہوجائے گا، جیسے وہ تمہارا جگری دوست ہو“۔[سورۂ فصلت:۳۴]

واقعی نصیب ور وہ شخص ہے جو بڑا اور کشادہ دل اپنے سینے میں رکھتا ہو، اس کے حق میں کسی نے غلطی کی ہو تو اسے معاف کرے، جو ظلم کرے، اسے درگزر کرے، اپنے بھائیوں، پڑوسیوں اور دوست واحباب کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں پر صبر کرے، بلکہ انھیں معذور سمجھے، ان کی کمی کوتاہی پر کوئی عذر تلاش کرکے ان کی طرف سے دل کو صاف رکھے، کسی کے لیے دل میں کینہ، حسد یا نفرت وعداوت نہ رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا دل رکھنے والے وہ صابر وشاکر اور متواضع وخاکسار لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دلوں کو کینہ وبغض اور حسد وعناد کی گندگیوں سے پاک صاف کرچکے ہوتے ہیں، پھر ان کے دل

سعادتوں اور خوشیوں کا گہوارہ بن جاتے ہیں۔

جس شخص کو اخلاص اور عملِ صالح کی توفیق مل جائے اور اسی حال میں اس کی وفات ہوجائے یعنی حسنِ خاتمہ نصیب ہوجائے تو وہ ہے دراصل نصیب والا۔

«عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا اسْتَعْمَلَهُ» فَقِيلَ: كَيْفَ يَسْتَعْمِلُهُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «يُوَفِّقُهُ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ».

[رواه الترمذي]

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے کام میں لگادیتے ہیں، عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کس طرح کام میں لگادیتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: "موت سے پہلے اسے نیک عمل کی توفیق دے دیتے ہیں"۔[ترمذی شریف]

حقیقی اقبال مند وہ ہے جس سے خود حق سبحانہ وتعالیٰ محبت فرمائیں، پھر آسمان والے اس سے محبت کریں، اس کے بعد زمین والے بھی اس سے محبت کرنے لگیں؛ کیوں کہ وہ اللہ کے ان نیک بندوں میں سے ہوتا ہے، جو زمین میں خیر وبھلائی پھیلاتے ہیں، رشد وہدایت کی محنت میں لگے رہتے ہیں، لوگوں کی نفع رسانی کے لیے تن من دھن کی بازی لگادیتے ہیں، جو خیر وبھلائی اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«إِذَا أَحَبَّ اللهُ الْعَبْدَ نَادَى جِبْرِيلَ: إِنَّ اللهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحْبِبْهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ فَيُنَادِي جِبْرِيلُ فِي أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللهَ

يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ». [صحيح البخاري]

”جب اللہ تعالیٰ بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبریل علیہ السلام کو آواز دیتے ہیں کہ فلاں شخص کو اللہ محبوب رکھتا ہے، لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو، چناں چہ جبریل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور وہ آسمان والوں کو کہتے ہیں کہ فلاں شخص سے اللہ محبت فرماتے ہیں، لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو، چناں چہ تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر روئے زمین پر اس کی مقبولیت (اور محبوبیت) رکھ دی جاتی ہے“۔[بخاری شریف]

خوش بخت وہ کہلائے گا جو فرائض وواجبات کے ساتھ سنن ونوافل کی بھی کثرت رکھتا ہو، خواہ وہ نفلی نمازیں ہوں، نفلی روزے ہوں یا نفلی صدقات وخیرات ہوں اور اذکار و اَوراد ہوں، کیوں کہ وہ ان نوافل کی وجہ سے اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، لہٰذا اس سے بڑا اقبال منداور خوش نصیب کون ہوگا جو محبوبِ الٰہی ہوجائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (یعنی حدیثِ قدسی میں ہے):

«وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأعطينَّه، وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي لأعيذنَّه». [صحيح البخاري]

”اور میرا بندہ میرا قرب اس سے زیادہ کسی چیز سے حاصل نہیں کرسکتا جو

میں نے اس پر فرض کیے ہیں، (یعنی سب سے پسندیدہ عبادتیں اللہ کے نزدیک فرائض ہیں، جن کے ذریعے بندہ اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے) اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اور جب وہ مجھ سے مانگتا ہے تو اسے عنایت کرتا ہوں، اور اگر وہ میری پناہ مانگتا ہے تو ضرور اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہوں"۔ [بخاری شریف]

خوش نصیب بندہ وہ ہے جو حسین اخلاق، خوب صورت صفات اور اعلیٰ کردار کا نمونہ ہو، لوگوں کے ساتھ معاملات میں صفائی، صداقت اور امانت کا ہمیشہ خیال رکھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ کو مخاطب کرکے فرمایا:

«يَا أَبَا ذَرٍّ، أَلَا أَدُلُّكَ عَلَي خَصْلَتَيْنِ هُمَا أَخَفُّ عَلَي الظَّهْرِ، وَأَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ غَيْرِهِما؟». قَالَ: بَلَي يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «عَلَيْكَ بِحُسْنِ الْخُلُقِ وَطُولِ الصَّمْتِ، فَوَالَّذِي نَفْسِيْ بِيَدِهِ، مَا عَمِلَ الْخَلَائِقُ بِمِثْلِهِمَا».

[رواه الطبراني وأبويعلى، والترغيب والترهيب]

"ابوذر! میں تمہیں ایسی دو خصلتیں نہ بتاؤں جو پشت پر تو ہلکی ہیں، لیکن ترازو میں اپنے سوا سے بھاری ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ! (یعنی ضرور بتائیں) آپؐ نے فرمایا: حسنِ اخلاق اور لمبی خاموشی کو اختیار کرلو، کیوں

کہ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، کہ لوگوں کے اعمال میں ان دونوں کی مثال نہیں ہے"۔

[الطبرانی۔ابویعلی وفی الترغیب والترہیب]

لوگوں میں سب سے بڑا خوش نصیب وہ ہے جو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہو، اپنے رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہو، اپنے ہم سایوں کے حقوق ادا کرتا ہو، فقیروں اور مسکینوں کے ساتھ ہم دردی رکھتا ہو، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی اپنی بساط کے مطابق مدد و نصرت کرتا ہو، اور یہ سب کچھ رضائے الٰہی کے لیے کرتا ہو، اللہ تعالیٰ حسنِ عمل کرنے والوں کا عمل ضائع نہیں ہونے دیتے۔

یقیناً وہ شخص نصیب والا ہے جسے قیام اللیل اور سحر کے وقت استغفار کی توفیق مل جائے، پھر مزید اذکار واوراد پڑھنے کی بھی سعادت نصیب ہو جائے۔

کس قدر خوش نصیب ہوگا وہ شخص جس نے ایسے اعمالِ صالحہ انجام دیے جن کا اجر اسے قبر میں بھی ملتا رہے گا، دنیا میں جو اجر ملے گا اور اس پر جو ثمرات مرتب ہوں گے وہ اس کے سوا ہیں جو قبر میں اور آخرت میں ملیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«سَبْعٌ يَجْرِي لِلْعَبْدِ أَجْرُهُنَّ وَهُوَ فِي قَبْرِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ: مَنْ عَلَّمَ عِلْمًا، أَوْ أَجْرَى نَهْرًا، أَوْ حَفَرَ بِئْرًا، أَوْ غَرَسَ نَخْلا، أَوْ بَنَى مَسْجِدًا، أَوْ وَرَّثَ مُصْحَفًا، أَوْ تَرَكَ وَلَدًا يَسْتَغْفِرُ لَهُ بَعْدَ مَوْتِهِ». [صحيح الجامع]

"سات چیزیں ہیں جن کا اجر بندے کو ملتا رہتا ہے، حالاں کہ وہ مرنے کے

بعد اپنی قبر میں ہوتا ہے: جس نے کسی کو (اچھی) تعلیم دی ہو، یا نہر جاری کرادی ہو، یا کنواں کھدوادیا ہو، یا کھجور کا درخت لگادیا ہو، یا کسی مسجد کی تعمیر کرائی ہو، یا کسی کو مصحف یعنی قرآنِ کریم کا وارث بنایا ہو (یعنی قرآنِ کریم کی طباعت کراکر یا مطبوعہ قرآن کو خرید کر یا خود لکھ کر وقف کر کے گیا ہو یا کسی کو دے کر گیا ہو یا وارث بنا کر مرا ہو، تمام صورتیں اس میں داخل ہیں) یا ایسی اولاد چھوڑ کر جائے جو مرنے کے بعد اس کے لیے مغفرت کی دعا کرے"۔[صحیح الجامع]

واقعی اور حقیقی اقبال مند، خوش قسمت اور خوش نصیب انسان وہی ہے جس کے اندر مذکورہ اوصاف ہوں یا اس طرح کے دیگر اعلیٰ ترین اوصاف ہوں۔ یہ چند نمونے ہیں جو ذکر کیے گئے، اس طرح کی خصوصیات کا حامل شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت، یقیناً سعادت مند اور بانصیب ہے، اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ قیمتی ہے، اس نے اپنی زندگی کا مقصد سمجھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو استعمال کیا، اس لیے سعادت مندی اور اقبال مندی اس کا مقدر بنی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان سعادت مندوں اور خوش نصیبوں میں شامل فرمائیں۔ آمین

"محروم" شخص کون ہے؟

خوش قسمت اور خوش نصیب کے بالمقابل "بدقسمت" یا بدنصیب، یا محروم جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، جن لوگوں کے لیے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں، عام طور پر مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ دنیاوی زیب زینت کی چیزوں سے محروم ہیں، مال و دولت کی کمی ہے، جاہ و منصب یا بارآور ملازمت سے محروم ہیں یا کوئی ماڈی اور دنیوی وجاہت وغیرہ انہیں

نہیں ملی؛ لیکن حقیقی محرومی یہ نہیں ہے جسے عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں؛ بلکہ حقیقی بدنصیبی یہ ہے کہ انسان، ایمان ویقین کی نعمتِ بے کراں سے محروم ہو، ایمان کی لذت وحلاوت، اس سے حاصل ہونے والی قلبی سلامتی اور طمانینت سے اور اس کی انسیت سے ناآشنا ہو۔ ایمان کا ایک ذائقہ ہے جسے وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کے دل میں ایمان گھر کر چکا ہو، اس کے تقاضوں پر اس کے اعضاو جوارح عمل کرنے لگے ہوں۔ ارشاد نبوی ہے:

«ذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِمُحَمَّدٍ (ﷺ) رَسُولًا». [مسلم]

”اسلام کا (حقیقی) مذاق اسے مل گیا جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا“۔ [مسلم شریف]

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان کی بھی ایک چاشنی ہے، جسے حقیقی مومن ضرور محسوس کرے گا، لہٰذا خوش قسمت اور بامراد ہے وہ مومن جسے یہ چاشنی اور یہ مذاق حاصل ہو جائے۔

حقیقی محروم ونامراد وہ شخص ہے جو اللہ کی شریعت سے بالکل ناواقف ہو، رسول اکرم ﷺ کی سیرت وسنت سے غافل ہو، ذکر الٰہی سے بے نیاز ہو، بلکہ نفس پرستی اور شہوت پرستی کے دَل دَل میں پھنسا ہوا ہو، گناہوں کا گٹھر اپنے کاندھے پر لادے ہوئے بغیر توبہ کے زندگی گزار رہا ہو، حرام لذتوں کے پیچھے پڑ کر (جو عارضی ہیں) ہمیشہ کی (دائمی) لذت ونعمت سے خود کو محروم کر رہا ہو، یہ ایسا نامراد ہے کہ آخرت کی لذت سے تو محروم ہو گا ہی، دنیا میں بھی دلی چین وسکون سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُۥ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ أَعْمَىٰ ﴿١٢٤﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىٓ أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ﴿١٢٥﴾ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ ءَايَـٰتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ ٱلْيَوْمَ تُنسَىٰ ﴿١٢٦﴾ ﴾ [طه: ١٢٤ – ١٢٦]

”اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی، اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ: یارب! تونے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، حالاں کہ میں تو آنکھوں والا تھا؟ اللہ کہے گا: اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آتی تھیں، مگر تونے انہیں بھلادیا۔ اور آج اسی طرح تجھے بھلادیا جائے گا“۔[سورۂ طٰہٰ:۱۲۴-۱۲۶]

بدقسمت اور حقیقی محروم وہ شخص ہے جو شب وروز کی زندگی غفلت میں گزاردے، اور محض دنیاوی متاع کے حصول میں سرگرداں رہ کر اپنی صحت، مال ودولت، وقت اور پوری عمر گنوادے اور جب یہاں سے آخری سفر کا وقت آئے تو خالی ہاتھ جانا پڑے، اس سفر کے لیے کوئی توشہ اس کے پاس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا۟ مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَـٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا ﴿٢٣﴾ ﴾

[الفرقان: ٢٣]

”اور انہوں نے (دنیا میں) جو عمل کیے تھے، ہم ان کا فیصلہ کرنے میں آئیں گے تو انہیں فضا میں بکھرے ہوے گرد وغبار (کی طرح بے قیمت) بنادیں گے“۔[سورۂ فرقان:۲۳]

اس سے بڑا محروم کون ہوگا جس کی زبان اور جس کا قلب ذکر کی لذت سے ناآشنا

ہو، حالاں کہ یہ آسان ترین عبادت ہے، جس کا عظیم ترین اجر و ثواب ہے۔

بدنصیب وہ ہے جسے معلوم ہے کہ قرآنِ کریم، کتابِ ہدایت ہے اور امراض قلب کے لیے شفا بھی ہے، بلکہ امراض بدن کے لیے بھی شفا ہے، اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی تلاوت کرنے والے کو ہر ہر حرف پہ دس دس نیکیاں ملتی ہیں، اس کے باوجود دن ورات گزر جاتے ہیں، بلکہ ہفتے اور مہینے گزر جاتے ہیں اور اس کی تلاوت کی توفیق نہیں ہوتی، یہ ہے وہ خسارہ اور محرومی جس کا کوئی عوض نہیں۔

ایک بڑا بدقسمت وہ بھی ہے جو اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو پائے، بالخصوص بُڑھاپے کی عمر میں، اور ان کی خدمت کرکے، انہیں راضی کرکے جنت کا استحقاق حاصل نہ کرسکے، کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ان کی رضا میں پوشید ہے۔ اس سے بڑا بدنصیب وہ ہے جو اپنی بدزبانی یا بدسلوکی کے ذریعہ ان کو اذیت پہنچائے، ان کے دلوں کو دکھ پہنچائے، جن کے سامنے ”اُف“ تک کہنے سے قرآن نے منع کیا ہے ان کے سامنے زبان درازی کرے، اگر کوئی احسان کرے تو احسان جتلائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے خوش نصیب بندوں میں شامل فرمائیں اور بدنصیبی، بدقسمتی اور محرومی سے ہماری حفاظت فرمائیں۔

❊ ❊ ❊

١/شوال/١٤٣٦ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عید الفطر ـــــ شکر و امتنان اور فرحت و سعادت

آج کا خوشیوں بھرا دن آپ سب کو مبارک ہو، یہ عید سعید آپ کو مبارک ہو، عید کی خوشیاں آپ کو ہمیشہ ملتی رہیں، عید جیسی پر مسرت بہاریں آپ ہمیشہ دیکھتے رہیں ــــ اللہ تعالیٰ آپ کے روزے، تراویح کی نمازیں، قیام اللیل، صدقات وخیرات اور تمام عبادتیں اور نیکیاں قبول فرمائیں۔

اس دنیا کا یہ دستور ہے کہ جو محنت کرتا ہے، اس کا صلہ پاتا ہے، جو مشقتیں برداشت کرتا ہے، تو راحت بھی اسے ملتی ہے، ہر مشکل کے ساتھ آسانی اور ہر مشقت کے بعد راحت ہے، عام قاعدہ یہی ہے، اسی قاعدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہم سے ایک ماہ مکمل روزے رکھنے کا مطالبہ کیا، دن بھر کھانے پینے اور صنفی تعلقات سے باز رہنے کا حکم دیا، جب اس حکم کی پیروی میں ہم ایک ماہ روزہ رکھ لیتے ہیں، تو اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ ہمیں عید کا پر مسرت اور پر بہار موقع عنایت فرماتے ہیں۔

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

لہٰذا جن لوگوں نے رمضان کے روزے رکھے اپنی راتوں کو تراویح اور قیام سے آباد کیا، صدقات وخیرات کیے، رمضان کے قیمتی لمحات کی قدر کی آج بجا طور پر انہیں حق ہے کہ رب العالمین کی طرف سے ملی ہوئی اس عید پر خوشیاں منائیں۔

عید کیا ہے؟

عید، دراصل رمضان کے روزے رکھنے کی توفیقِ الٰہی پر شکر وعبادت کا نام ہے، عید، فرحت وسعادت کا نام ہے، عید، دعوت وزیارت کا نام ہے، عید، محبت مودّت کا نام ہے، عید، ہم دردی اور اخوت کا نام ہے، عید، خوشیاں تقسیم کرنے اور مسکراہٹیں بکھیرنے کا نام ہے۔

اپنے اہل وعیال کو عید کی مبارک باد دینا، ان کے اوپر دل کھول کر (بغیر اسراف کے) خرچ کرنا، اپنے رشتے داروں، پڑوسیوں، دوستوں اور مسلمان بھائیوں کو دل سے مبارک باد پیش کرنا، حتی الامکان ہدایا وتحائف کا تبادلہ کرنا، ایک دوسرے کے دل میں سرور پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کرنا، فراخ دلی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنا، اپنے والدین اگر حیات سے ہیں تو ان کو اس امر میں اولویّت دینا، صلہ رحمی کرنا وغیرہ، یہ اور اس طرح کے کام انجام دینا جس سے گھر میں، محلے میں، معاشرے میں عید کی خوشی کے مظاہر نظر آرہے ہوں، یہ مطلوب ہے۔

﴿ قُلْ بِفَضْلِ ٱللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِۦ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُواْ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٥٨﴾ ﴾ [یونس: ۵۸]

”آپ کہہ دیجیے کہ: یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا

اسی پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کررہے ہیں"۔[سورۂ یونس:۵۸]

اگر آپ نے رمضان کے روزے رکھے، دیگر نیک اعمال کیے تو اب آپ کو اللہ کی اس نعمت پر خوشی منانے کا حق ہے، بلکہ اس پر خوش ہونا ایمان کی علامت ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَنْ سَرَّتْهُ حَسَنَتُهُ، وَسَاءَتْهُ سَيِّئَتُهُ فَهُوَ مُؤْمِنٌ».

[رواه الترمذي]

"جسے اپنی نیکی سے خوشی حاصل ہو اور برائی سے رنجیدگی، تو وہ مؤمن ہے"۔[ترمذی شریف]

یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے

بعض خشک زاہدین عید کے روز بھی زیرِ لب ذرا بھی مسکراہٹ آنے نہیں دیتے، اس خوشی کے دن بھی ماتم کا ماحول بنائے رہتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ان کا زُہد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد سے بالکل الگ ہے، نہ وہ کسی سے ملتے ہیں، نہ کسی کو ملنے کی اجازت دیتے ہیں، نہ مبارک باد دیتے ہیں، نہ کسی کی مبارک باد قبول فرماتے ہیں، اجتماعی زندگی سے میلوں دور اپنی انفرادی زندگی میں مگن رہتے ہیں، اپنے دروازے بھی دوسروں کے لیے بند رکھتے ہیں اور دوسروں سے ملنے کو بھی نہیں جاتے، حالاں کہ اجتماعی زندگی اور لوگوں سے میل جول رکھنے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں پر صبر کرنے کی افضلیت حدیث پاک سے ثابت ہے، الّا یہ کہ اپنے دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔

«الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ، وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ».

[ترمذي وابن ماجه]

”جو مؤمن لوگوں سے ملنا جلنا رکھتا ہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے، وہ بہتر ہے اس مؤمن سے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا اور ان کی اذیتوں پر صبر نہیں کرتا“۔[ترمذی وابن ماجہ]

لہٰذا عید کے اس پر مسرت اور بابرکت موقع پر اپنے دروازوں کو بھی کھول کر رکھیے اور اس سے پہلے اپنے دلوں کو کھول کر رکھیے، دلوں میں وسعت پیدا کیجیے، دل کھول کر لوگوں کا استقبال کیجیے، مبارک باد پیش کیجیے، کوئی مبارک باد پیش کرے تو بہ خوشی وصول کیجیے، شکریہ ادا کیجیے، دعائیں دیجیے کہ اللہ تعالیٰ سب کے روزے، نمازیں اور کارِ خیر قبول فرمائے۔

عید، دلوں کی کدورت دور کرنے کا حسین موقع

عید کی خوشیاں اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتیں جب تک آپ اپنے روٹھے ہوے رشتے داروں کو اللہ کی رضا کے لیے منا کر خوشی میں انہیں بھی شریک نہ کرلیں، آج کا دن صلح وصفائی کا دن ہے، آج کا مبارک دن تواضع کے ساتھ ہر ایک سے مصالحت کا دن ہے، رمضان کے مبارک مہینے میں جس طرح آپ نے روزے رکھ کر شب بیداری کرکے، گریہ وزاری کے ساتھ اپنے رب کریم کو منانے کی کوشش کی ہے، جس طرح اپنے پروردگار کے ساتھ صلح کرلی ہے، اسی طرح آج کے دن کوشش کریں کہ اسی پروردگار کی

خوش نودی کے لیے اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ بھی اگر خدانخواستہ کدورت ہے یا قطع تعلق ہے، تو مصالحت اور صلح صفائی کرلیں۔

صرف رشتے دار ہی نہیں، بلکہ کسی بھی مسلمان بھائی کے ساتھ کوئی ناراضگی ہے یا بات چیت بند ہے، تو آج اللہ کے لیے صلح کرلیجیے۔ اللہ تعالیٰ صلح کو پسند فرماتے ہیں، اس کے فائدے کو نہایت بلیغ انداز میں صرف دو لفظوں میں ذکر فرمایا ہے:

﴿وَٱلصُّلۡحُ خَيۡرٌ﴾ [النساء: ١٢٨] ”اور صلح کرلینا بہترین ہے“۔[سورۂ نساء:۱۲۸]

اسلام دلوں کی صفائی چاہتا ہے، پوری امت مسلمہ کو ”اُمتِ واحدۃ“ ایک امت کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے، جس طرح موتی کے دانوں کو ہار میں پرودیا جاتا ہے، اسی طرح پوری امت ”حبل اللہ“ یعنی اللہ کی رسی میں پروئی ہوئی نظر آنی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ آپس کے بغض، عناد، حسد، کینہ اور نفرت کو ختم کرکے بھائی بھائی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ كُنتُمۡ أَعۡدَآءً فَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِكُمۡ فَأَصۡبَحۡتُم بِنِعۡمَتِهِۦٓ إِخۡوَٰنًا﴾ [آل عمران: ١٠٣]

”اور اللہ نے تم پر جو انعام کیا ہے اسے یاد رکھو کہ ایک وقت تھا جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، اور تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے“۔[سورۂ آلِ عمران:۱۰۳]

لہٰذا بھائی بھائی بن کر رہنا، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا، باہمی روابط کو برقرار رکھنا دراصل اللہ کی نعمت ہے، جو شخص اس کے برخلاف زندگی گزارتا ہے، وہ اس عظیم نعمت سے محروم رہتا ہے۔

قوموں کی حقیقی صورت ان کی تقریبات میں

ایک مثل مشہور ہے:

«مَن أراد مَعرفـةَ أخـلاقِ أُمَّـةٍ مّـنْ الأمـمِ فَلْيراقِبْهـا في أعيَادهَا»

یعنی اگر کسی قوم کی اخلاقیات کا مشاہدہ کرنا ہو تو ان کی خوشیوں، تہواروں اور عیدوں میں دیکھیں۔ دنیا کی مختلف قوموں کے تہوار آپ نے دیکھے ہوں گے، ان کی تقریبات میں ہونے والی گھٹیا حرکتیں بھی دیکھی ہوں گی، شرابیں پی کر نشے کی حالت میں ناروا سلوک کرتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا، اپنی خوشی میں مست ہوکر دوسروں پر ظلم وستم کرتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا، اللہ کی بنائی ہوئی حسین شکلوں کو بگاڑ کر بلکہ مسخ کر کے ہڑبونگ مچاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ یہی ان کی اصلیت ہوتی ہے جو ان کی تقریبات میں، ان کے تہواروں میں اور ان کی خوشیوں میں نظر آتی ہے۔

ہماری قوم (امت اسلامیہ) کی بھی اپنی اخلاقیات ہیں، ہماری عیدوں میں ہماری اصلیت نظر آتی ہے، صاف ستھرے کپڑے پہن کر، خوشبو لگا کر اپنے رب کی کبریائی کے گن گاتے ہوئے ہم سب سے پہلے عید گاہ جاکر دو رکعت نماز ادا کر کے اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جائز حدود میں رہ کر خوشیاں مناتے ہیں، اس خوشی کے موقع پر بھی کسی ناجائز یا حرام کام کا ارتکاب نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے اگر کچھ چیزیں حرام قرار دی ہیں جو انسانوں کے لیے نقصان دہ ہیں، تو ان کا متبادل ضرور رکھا ہے، اکثر چیزیں تو جائز ہی ہیں، کچھ چیزیں ممنوع ہیں، جو ممنوع ہیں

انہیں اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ دینا ہے، بے شمار جائز اور حلال چیزیں ہیں جو ہماری مجلسوں کو زینت بخشتی ہیں، ہماری خواہشات کی تکمیل کرتی ہیں اور ہماری تقریبات میں چار چاند لگاتی ہیں۔ آپ یقین مانیں کہ ہماری عیدیں اور ہماری عبادتیں پرکشش بھی ہیں اور دوسروں کے لیے قابل رشک بھی۔

ان کو فراموش نہ کریں

اس پر مسرت موقع پہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کو فراموش نہ کریں، خواہ وہ کسی طرح کی مصیبت میں مبتلا ہوں: اقتصادی، سیاسی، جسمانی یا ناگہانی آفات وبلیات میں گھرے ہوں، بہ ہر حال اپنی حیثیت کے مطابق ان کا تعاون کریں، اس کی ابتدا اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے کریں، اپنی بستی، اپنے شہر اور اپنے ملک سے کریں، اور جہاں تک ممکن ہو اس دائرے کو وسیع کریں، کیوں کہ دنیا کے ہر خطے میں بسنے والا ہر کلمہ گو آپ کا بھائی ہے اور آپ کے تعاون اور آپ کی ہم دردی کا مستحق ہے، خواہ زکات الفطر کے ذریعے ہو، زکات المال کے ذریعے ہو یا نفلی صدقات وعطیات کے ذریعے ہو یا اپنی وجاہت اور مرتبے کی وساطت سے ہو۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ نیکی کرنے والوں کی نیکی ضائع نہیں ہوتی، صدقات سے بلائیں ٹلتی ہیں، دلوں کو سکون ملتا ہے، رحمتِ حق دست گیری کرتی ہے اور اس پر اجر وثواب مستزاد۔

رمضان کی کمائی برباد نہ کریں

رمضان کا مبارک مہینہ گزر گیا، رمضان کا روح پرور اور ایمان افروز مہینہ ختم ہو گیا۔ سحر کے وقت کی برکتیں، دن بھر کا روزہ، تلاوتوں کی کثرت، افطار کے وقت کی

دعائیں، افطار کے وقت پانی، شربت اور مختلف قسم کی نعمتوں کی لذتیں، نمازِ تراویح کا سہانا منظر، نالۂ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی، سحر کے وقت کا استغفار، جود و سخاوت نیکی اور خیرات کے کاموں کی رغبت، خیر و برکت اور رحمت و مغفرت کی موسلا دھار بارش وغیرہ کو کوئی ایمان والا بھول نہیں سکتا، سرکش شیاطین کے مقیّد ہونے کی وجہ سے ایک گنہ گار مسلمان بھی توبہ کرکے نیکوکار بن جاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورے مسلم معاشرے پر رحمتِ الٰہی کا ابرِ کرم سایہ فگن ہے اور روحانیت کی مینہ برس رہی ہے۔

ماہِ مبارک ختم ہونے کے بعد نشاط میں کمی کا آنا ایک فطری بات ہے، کیوں کہ اب نہ نورانی راتیں ہیں، نہ روح پرور اور ایمان افزا دن کا ماحول، لہٰذا چستی اور نشاط میں تھوڑی کمی ضرور آجائے گی، لیکن یکسر تمام اعمالِ صالحہ کو چھوڑ دینا نہایت محرومی کی بات ہے، قرآنِ کریم کو اٹھاکر صندوق میں بند کرکے رکھ دینا، قیام اللیل بالکل ترک کر دینا، محرومی کے سوا کچھ نہیں، بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو رمضان کے بعد فرض نمازیں بھی چھوڑ دیتے ہیں، ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رمضان میں گناہوں سے توبہ کر چکے تھے، لیکن رمضان بعد دوبارہ گناہوں کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ وہ رمضان کی عبادت کر رہے تھے، ربِّ رمضان کی نہیں، حالاں کہ رمضان اگرچہ ختم ہوگیا، لیکن ربِّ رمضان تو حیٌّ لا یَمُوت ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

طاعات پر استقامت اور مداومت (پابندی)

جب ہم نیک اعمال شروع کریں تو اس پر ڈٹے رہنے کی کوشش کریں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور توفیق مل جائے تو اس کی قدر کریں اور استقامت کی دعا کریں، کیوں کہ

رشد وہدایت اور روزہ نماز صرف ماہِ رمضان سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس پر مداومت اور استقامت مطلوب ہے، یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے مقررہ وقت آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَٱعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأۡتِيَكَ ٱلۡيَقِينُ ﴿٩٩﴾ ﴾ [الحجر: ٩٩]

”اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو، یہاں تک کہ تم پر وہ چیز آجائے جس کا آنا یقینی ہے“۔ (یعنی موت) [سورۂ حجر:۹۹]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے محبوب عمل وہ تھا جس پر مداومت اور ہمیشگی ہو، عمل کی عادت ڈال کر چھوڑ دینا آپ کو پسند نہیں تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

«كَانَ أَحَبُّ الْعَمَلِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ الَّذِي يَدُومُ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ». [صحيح البخاري]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب عمل وہ تھا جس پر آدمی ہمیشہ قائم رہے“۔ [بخاری شریف]

لہٰذا ربّانی بننے کی کوشش کریں، رمضانی نہیں، جو رمضان کی عبادت کرتے تھے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رمضان ختم ہوگیا، لیکن جو ربِّ رمضان کی عبادت کرتے تھے، ان کا رب زندہ وجاوید ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔

قبولیت کی علامت

کسی عملِ صالح کی قبولت کی منجملہ علامات کے ایک علامت یہ بھی ہے کہ نیکی کے بعد

مزید نیکی کی توفیق اور جو نیکی پہلے کی گئی اس پر ہمیشگی نصیب ہو، لہٰذا رمضان میں کیے گئے اعمال کی قبولیت کی یہ علامت ہے کہ استقامت نصیب ہو، اعمال پر مداومت کی توفیق مل جائے ـــــ فرائض تو کسی حال میں نہ چھوٹیں، اگر قرآنِ کریم کی تلاوت کی توفیق رمضان میں مل گئی تھی، تو رمضان بعد بھی برقرار رکھیں، تہجد کی عادت اگر ماہِ رمضان میں پڑ گئی تھی تو اسے پوری زندگی کی عادت بنالیں، استغفار کی کثرت، تسبیح و تہلیل اور درودِ پاک سے اپنی زبان اگر رمضان میں تر رکھتے تھے، تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہمیشہ زبان کو اس سے تر رکھیں، اسی طرح اگر صدقات وخیرات کی توفیق ملی تھی تو اس عمل کو بھی جاری رکھیں، ظاہر ہے کہ رمضان کے مبارک مہینے میں جو اعمال کی رغبت اور گناہوں سے نفرت تھی وہ غیر رمضان میں نہیں ہوگی، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ بالکل ہی سارے معمولات سے دست بردار ہو جائیں، بلکہ کسی نہ کسی درجے میں ان اعمال کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بنالیں اور ان پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے روزے، تراویح، تہجد، صدقات وخیرات، تلاوتِ قرآنِ پاک اور دیگر تمام اعمالِ صالحہ قبول فرمائیں اور استقامت نصیب فرمائیں۔

تَقَبَّلَ اللهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ صَالِحَ الْأَعْمَالِ.
وَكُلُّ عَامٍ وَأَنْتُمْ بِخَيْرٍ.

❋ ❋ ❋

۱۴۴۲/۱۲/۱۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عید الاضحیٰ ــــــ مقاصد واحکام

آج عید الاضحیٰ کا دن ہے، آج خوشی کا دن ہے، شریعت نے ہمیں یہ عید عنایت کی ہے اور خوشی منانے کا حکم دیا ہے، لہٰذا آج خوشیاں منانا اور دوسروں کے درمیان خوشیاں تقسیم کرنا مطلوبِ شریعت ہے اور باعث اجر بھی ہے۔

ہماری صرف دو عیدیں ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ، ان دونوں عیدوں میں جو امتیازی شان ہے وہ یہ ہے کہ ہر عید میں دو پہلو ہیں، ایک ربانی اور روحانی پہلو اور دوسرا انسانی پہلو، روحانی اور ربانی پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی عیدوں کو تکبیر وتہلیل، عبادت وشکرگزاری سے آباد کریں، اسی لیے دونوں عیدوں میں تکبیر کہنا، بلکہ تکبیر کی کثرت کرنا مشروع ہے، رمضان کے روزے رکھنے کے بعد جب پورا مہینہ مکمل ہوجائے تو اس توفیق وہدایت پر تکبیر کہنی ہے:

﴿وَلِتُكۡمِلُواْ ٱلۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُواْ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ ١٨٥﴾ [البقرة: ١٨٥]

”تاکہ تم روزوں کی گنتی پوری کرلو، اور اللہ نے تمہیں جوراہ دکھائی ہے، اس

پر اللہ کی تکبیر کہو، اور تا کہ تم شکر گزار بنو"۔ [سورۂ بقرۃ:۱۸۵]

اسی طرح عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی کثرت سے تکبیر کہنے کا حکم ہے، عید الاضحیٰ کا چاند نظر آجائے اسی وقت سے تکبیر کا حکم ہے اور ۹/ذی الحجہ سے تیرہ کی عصر تک تو ہر فرض نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر کا حکم ہے۔

اسی طرح ہماری خوشیوں کا آغاز دو رکعت نماز سے ہوتا ہے، دونوں عیدوں کی نمازوں میں بھی دیگر نمازوں کی بنسبت تکبیرات کا اضافہ ہے — یہ سب ربانی اور روحانی پہلو کے مظاہر ہیں۔

دوسرا انسانی پہلو ہے، چناں چہ عید الفطر میں نمازِ عید ادا کرنے سے پہلے ہر صاحبِ استطاعت کے لیے ضروری ہے کہ فقیروں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھتے ہوے صدقۃ الفطر ادا کرے، تا کہ معاشرے میں کوئی بھی عید کے روز مایوس اور محروم نظر نہ آئے، اپنی خوشی میں معاشرے کے تمام افراد کو شریک کریں، اپنی اولادوں کے ساتھ غریبوں کی اولادوں پر بھی شفقت کا ہاتھ پھیریں، ہدایا تحائف کے ذریعے انہیں بھی خوش کریں۔

عید الاضحیٰ میں بھی انسانی پہلو یہ ہے کہ قربانی کر کے گوشت خود بھی کھائیں اور اعزہ اقارب، دوست احباب اور فقیر و محتاج سب کو کھلائیں، بلکہ مسلمان جب تک اپنے ضرورت مند بھائیوں، رشتے داروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کر کے، خاموشی سے ان کی حاجت روائی نہیں کرلیتا، اپنی خوشی کی لذت اسے محسوس نہیں ہوتی، لیکن جب وہ کسی حاجت مند کی حاجت پوری کرلیتا ہے تو اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہوجاتا ہے اور حقیقی مسرت اسے اسی وقت حاصل ہوتی ہے۔

قربانی اور اس کا پس منظر

عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہم سے قربانی کا مطالبہ کیا گیا ہے، قربانی پیش کرنا، دراصل محبت کی توثیق ہے، قربانی، محبت کی علامت ہوتی ہے، بلکہ ہر محبت، قربانی مانگتی ہے، اسی محبت کے تقاضے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں پر مختلف انداز سے قربانیاں مقرر فرمائی تھیں، ان سے مطالبہ فرمایا کہ اللہ کے نام پر قربانی پیش کریں۔ قرآنِ کریم کی سورۃ الحج میں ارشاد ہے:

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ فَلَهُۥٓ أَسْلِمُوا۟ ۗ وَبَشِّرِ ٱلْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ ﴾ [الحج: ٣٤]

”اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی اس غرض سے مقرر کی ہے کہ وہ ان مویشیوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں عطا فرمائے ہیں — لہٰذا تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے، چناں چہ تم اسی کی فرماں برداری کرو، اور خوش خبری سنا دو ان لوگوں کو جن کے دل اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں“۔ [سورۃ الحج:۳۴]

رسول اکرم ﷺ سے قربانی کے حوالے سے جب دریافت کیا گیا کہ یہ قربانی کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ”یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے“۔ [ابن ماجہ]

حضرت ابراہیم علیہ وعلیٰ نبینا الصلاۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے کئی طرح سے آزمایا، ان کا امتحان بہت سخت ہوا، ہر امتحان میں کامیاب ہوتے گئے، انہی امتحانات میں سے ایک امتحان یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد مبارک فرزند

(اسماعیل کی شکل میں) عنایت فرمایا اور جب وہ کچھ بڑے ہوگئے تو اسی بیٹے کی قربانی کا مطالبہ آگیا، وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کردیتے تھے، اس حکم کے سامنے بھی جو نہایت سخت آزما تھا دل وجان سے راضی تھے، تاہم اپنے پیارے بیٹے سے بھی ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے یہ قصہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں تمہیں ذبح کروں (یہ حکم انہیں خواب کے ذریعہ دیا گیا تھا) فرماں بردار بیٹے نے بغیر چوں چرا کے عرض کردیا کہ والد گرامی! آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اسے کر گزریے، میں اس پر صبر کروں گا —— چناں چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے فرزند کو لے کر مذبح کی طرف جانے لگے، راستے میں شیطان نے ان کا پیچھا کیا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے آگے بڑھ گئے، پھر انہیں لے کر حضرت جبریل علیہ السلام منی کے "جَمرۂ عَقَبہ" تک پہنچے، پھر شیطان نے ان کا پیچھا کیا تو انہوں نے شیطان کو سات کنکڑیاں ماریں، وہ بھاگ گیا، لیکن پھر "جمرۂ وسطیٰ" کے پاس نظر آیا، چناں چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں بھی اسے سات کنکڑیوں سے مارا، اس کے بعد حضرت اسماعیل کو پیشانی کے بل لٹادیا تاکہ گردن کی طرف سے ذبح کریں اور وہ دیکھ نہ سکیں، حضرت اسماعیل کے بدن پہ سفید قمیص تھی، انہوں نے والد گرامی سے عرض کیا: ابو جان! میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہے جس میں آپ میری تکفین کریں (یعنی کفن پہنائیں) لہٰذا قمیص اتار لیجیے، قمیص اتار ہی رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی: "اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا ثابت کردیا" یہ روایت امام احمد ابن حنبلؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے ذکر کی ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ شیطان جمرۂ اولیٰ کے پاس نظر آیا تو انہوں نے سات کنکڑیاں ماریں، پھر بھاگ کر "جمرۂ وسطیٰ" کے پاس گیا، وہاں بھی سات کنکڑیاں ماریں، پھر

جمرۂ کبریٰ کے پاس گیا، وہاں بھی سات کنکڑیاں ماریں، پھر بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے لٹادیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سفید مینڈھا حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے بھیجا اور حضرت ابراہیمؑ کو ان کی عظیم کامیابی کی بشارت سنائی۔ قرآن کریم کی سورۃ الصافات کی آیت نمبر ۱۰۰ سے ۱۱۰ تک کی آیات کو پڑھیے جن میں اس قصے کو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے:

﴿ فَبَشَّرْنَٰهُ بِغُلَٰمٍ حَلِيمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ ٱلسَّعْىَ قَالَ يَٰبُنَىَّ إِنِّىٓ أَرَىٰ فِى ٱلْمَنَامِ أَنِّىٓ أَذْبَحُكَ فَٱنظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَٰٓأَبَتِ ٱفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِىٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٠٢﴾ فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلْجَبِينِ ﴿١٠٣﴾ وَنَٰدَيْنَٰهُ أَن يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ ٱلرُّءْيَآ ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٠٥﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْبَلَٰٓؤُا۟ ٱلْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى ٱلْءَاخِرِينَ ﴿١٠٨﴾ سَلَٰمٌ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ ﴿١٠٩﴾ كَذَٰلِكَ نَجْزِى ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١١٠﴾ ﴾

[الصافات: ۱۰۱ - ۱۱۰]

”چناں چہ ہم نے انہیں (ابراہیم کو) ایک بردبار لڑکے کی خوش خبری دی، پھر جب وہ بچہ اتنی عمر کو پہنچا کہ اس کے ساتھ چلے پھرے، تو اس (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا کہ میرے پیارے بچے! میں خواب میں اپنے آپ کو تجھے ذبح کرتے ہوے دیکھ رہا ہوں۔ اب تو بتا کہ تیری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے جواب دیا کہ ابّا! جو حکم ہوا ہے اسے بجالائیے، ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ چناں چہ جب دونوں نے سر جھکا دیا، اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل گرادیا۔ اور ہم نے اسے آوز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یقیناً

ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلا ہوا امتحان تھا۔ اور ہم نے ایک عظیم ذبیحہ کا فدیہ دے کر اس بچے کو بچا لیا۔ اور جو لوگ ان کے بعد آئے ان میں یہ روایت قائم کی (کہ وہ یہ کہا کریں کہ) سلام ہو ابراہیم پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح صلہ دیتے ہیں"۔ [سورۂ الصافات:۱۰۱-۱۱۰]

اس قصے کے درخشاں اور قابلِ عبرت پہلو

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل تھے، محبوب اور خلیل دونوں قریب المعنیٰ ہیں، لیکن خلیل میں محبت کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، اسی لیے ہر خلیل محبوب بھی ہوتا ہے، لیکن ہر محبوب خلیل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا تھا، حضرت ابراہیم اس "خُلّت" کے تقاضے کو پورا کرنا جانتے تھے، اس لیے اللہ کے اشاروں پر عمل کرتے تھے، اپنے اکلوتے بیٹے کو جو پیرانہ سالی میں ملا تھا اور اب اس سے تعاون ملنے کی توقع تھی، صرف اشارۂ الٰہی پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ نبی کا خواب، وحی کے حکم میں ہوتا ہے، انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ اپنے فرزند حضرت اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں، صریح حکم نازل نہیں ہوا تھا، لیکن اس خواب پر انہوں نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا جو صرف خلیل ہی کر سکتا تھا۔

دوسری طرف کم عمر بیٹے کی فرماں برداری دیکھیے، باپ کی عظمت اس کے دل میں کس قدر تھی کہ بلا چوں چرا کے ذبح ہونے کے لیے تیار ہوگئے اور کہا کہ: آپ کو جس کا حکم ہوا ہے اسے کر گزریے۔

نیز اس چھوٹی عمر میں وہ صبر کے کس مرتبے پہ پہنچے تھے کہ ذبح ہونے پر صبر کرنے

کے لیے تیار تھے، کہا: ”آپ، ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے“۔ اس عمر میں ایمان کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ اس صبر کو اللہ کی مشیت پہ موقوف رکھا، کیوں کہ جان دینے پر صبر کرنا بندے کے بس میں نہیں، اس لیے کہا: ”ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے“۔

اس قصے سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ پاک بندے کو صرف آزمانا چاہتے ہیں، اس سے ہر قربانی لینا نہیں چاہتے، لیکن ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے اسے تیار دیکھنا چاہتے ہیں، اسی لیے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ سے جس قربانی کا مطالبہ تھا، وہ اسے دینے کے لیے تیار ہو گئے، تو اللہ نے انہیں کامیابی کی سند دے دی اور بیٹے کی قربانی کی جگہ حضرت جبریلؑ کے ذریعے جنت سے مینڈھا بھیج کر اس کی قربانی کرائی اور یہ ادا، اتنی پسند آئی کہ قیامت تک کے لیے اس سنت کو جاری اور مشروع قرار دے دیا۔

حضرت ابراہیمؑ اگر چاہتے تو حکم ملنے کے بعد بیٹے سے مشورہ کیے بغیر ہی اسے نافذ کر دیتے، لیکن انہوں نے نو عمر بیٹے سے بھی مشورہ کیا، ان سے ان کی رائے طلب کی، جس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، یہ تربیت کا ایک اہم پہلو ہے کہ بچوں کو اپنے اعتماد میں لیا جائے، بعض امور میں ان سے ان کی رائے مانگی جائے، تاکہ انہیں یہ محسوس ہو کہ فیملی میں ان کا کوئی مقام ہے، بچہ سمجھ کر اگر انہیں نظر انداز کیا جائے گا، تو اپنی بے وقعتی اور توہین کا احساس ہو گا، یہ تربیت کا وہ اہم پہلو ہے جسے عام طور پر لوگ نہیں جانتے یا عمل میں نہیں لاتے۔

قربانی کے فضائل

قربانی کا عمل بوجھ سمجھ کر یا تنگ دلی کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جس مالک نے

قربانی کرنے کے قابل بنایا ہے، اسی نے یہ قربانی پیش کرنے کے لیے کہا ہے، لہٰذا خوش دلی کے ساتھ انجام دینا چاہیے، کیوں کہ قربانی کے دنوں میں قربانی سے زیادہ محبوب، کوئی دوسرا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہیں ہے، جس جانور کی قربانی دی جاتی ہے، اس کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اسے قبولیت کا شرف حاصل ہوجاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«مَا عَمِلَ آدَمِيٌّ مِنْ عَمَلٍ يَوْمِ النَّحْرِ، أَحَبَّ إِلَى اللهِ مِنْ إِهْرَاقِ الدَّمِ، إِنَّهَا لَتَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُونِهَا، وَأَشْعَارِهَا، وَأَظْلَافِهَا، وَإِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ أَنْ يَقَعَ مِنَ الْأَرْضِ، فَطِيبُوا بِهَا نَفْسًا». [رواه الترمذي]

”قربانی کے دن کسی بھی آدمی کا کوئی عمل اللہ کے نزدیک خون بہانے سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے، قیامت کے روز قربانی کے جانور اپنی سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئیں گے۔ قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا شرف حاصل کرلیتا ہے، لہٰذا تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کرو“۔

[ترمذی شریف]

قربانی کے احکام

بعض اہل علم کے نزدیک صاحبِ استطاعت کے لیے قربانی کرنا سنت مؤکدہ ہے، لیکن حنفیہ کے ہاں واجب ہے، یہی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی بھی ہے کہ قربانی کے دنوں میں اگر کوئی شخص صاحب استطاعت ہو تو اس پر قربانی کرنا واجب ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے صیغۂ امر کے ذریعے اس کو مشروع فرمایا ہے:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنْحَرْ ﴿٢﴾ ﴾ [الكوثر: ٢]

"لہٰذا تم اپنے پروردگار (کی خوش نودی) کے لیے نماز پڑھو، اور قربانی کرو"۔[سورۂ کوثر:۲]

بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:

«ضَحَّى النَّبِيُّ ﷺ بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ أَقْرَنَيْنِ، ذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ، وَسَمَّى، وَكَبَّرَ، وَوَضَعَ رِجْلَهُ عَلَى صِفَاحِهِمَا».

[صحيح البخاري]

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سینگ والے چتکبرے مینڈھوں کی قربانی کی۔ انہیں اپنے ہاتھ سے ذبح فرمایا۔ بسم اللہ اور اللہ اکبر پڑھا اور اپنا پاؤں ان کی گردن پر رکھ کر ذبح فرمایا"۔[بخاری شریف]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پاک ہجرت فرمانے کے بعد دس سال تک باقاعدگی کے ساتھ ہر سال قربانی کی، اور اس عمل کو اس طرح اہتمام کے ساتھ انجام دیتے تھے جس سے اس کا شعائرِ اسلام میں سے ہونا معلوم ہو۔

ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے، جو وسعت اور مالی کشادگی کے باوجود قربانی نہیں کرتے۔

«مَنْ وَجَدَ سَعَةً فَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا». [رواه أحمد وابن ماجه وهو صحيح موقوفا، وضعيف مرفوعا]

"جو شخص وسعت رکھتا ہو، پھر بھی قربانی نہ کرے تو وہ ہرگز ہماری عیدگاہ

کے قریب نہ آئے"۔ [احمد وابن ماجہ]

اس حدیث پاک میں حکمِ قربانی کا جو انداز بیان ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا حکم وجوب کا ہے نہ کہ استحباب کا۔

جو مسلمان عاقل بالغ مقیم اور صاحب نصاب ہو اس پر قربانی کرنا واجب ہے، قربانی کا وقت جہاں عید کی نماز ادا کی جاتی ہو وہاں نماز ادا کرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور بارہویں ذی الحجہ کے غروب تک اس کا وقت رہتا ہے۔ (بعض ائمہ کے نزدیک تیرہویں کی شام تک اس کا وقت ہے) نمازِ عید سے قبل اگر کسی نے قربانی کی تو یہ معتبر نہیں ہوگی۔

شریعت نے قربانی کے جانوروں کی عمریں مقرر کی ہیں، اونٹ کی پانچ سال، گائے بیل، بھینس ہوں تو دو سال اور بکرا یا بکری یا بھیڑ ہو تو ایک سال اور دنبہ ہو تو چھ ماہ۔ ان متعیّنہ عمروں سے اگر کم کا جانور ہو تو اس کی قربانی درست نہیں ہوگی۔ البتہ اگر زیادہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

جن جانوروں کی قربانی کی جائے وہ بے عیب ہونے چاہییں، عیب دار جانور کی قربانی صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَرْبَعٌ لَا تُجْزِئُ: الْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا، وَالْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا، وَالْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ظَلْعُهَا، وَالْكَسِيرُ الَّتِي لَا تُنْقِي».

[رواه أبوداؤد، والترمذي، وأحمد]

"چار قسم کے جانور قربانی کے لیے کافی نہیں ہوتے: وہ بھینگا جانور جس کا بھینگا پن واضح ہو، بیمار، جس کی بیماری واضح ہو، لنگڑا، جس کا لنگڑا پن واضح ہو اور ایسا دُبلا جانور کہ جس کی ہڈی میں گودا نہ ہو"۔ [ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«أمَرَنا رسولُ الله ﷺ أَنْ نَسْتَشْرِفَ العينَ والأُذنَ، ولا نُضحِّيَ بعَوْرَاءَ، ولا مُقابلَةٍ ولا مُدَابَرةٍ، ولا خَرْقَاءَ، ولا شَرْقَاءَ». [رواه أبوداؤد]

”ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ ہم (قربانی کے جانوروں کی) آنکھ اور کان خوب غور سے دیکھ لیں، اور کانے جانور کی اور جس جانور کا کان آگے سے یا پیچھے سے کٹا ہو اس کی یا جس کا کان چیرا گیا ہو اس کی قربانی نہ کریں“۔ [ابوداؤد]

قربانی پر کیے جانے والے چند اعتراضات اور ان کے جوابات

اعتراضات کی فہرست بہت لمبی ہے، اور اگر تفصیل سے سب کا جواب دیا جائے تو خطبہ بہت لمبا ہو جائے گا، مختصر طور پر چند نمایاں قسم کے اشکالات اور اعتراضات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قربانی کی وجہ سے جانوروں کی نسل کشی ہوتی ہے۔ یہ فضول خرچی ہے۔ اس بڑی رقم کو جمع کر کے غریبوں میں اور رفاہِ عامہ میں، مثلاً، ہاسپٹل، اسکول وغیرہ میں خرچ کیا جائے تو زیادہ نفع ہوگا۔ اس قربانی کی وجہ سے معیشت کا بھی نقصان ہے۔ گوشت کھانے سے درندگی پیدا ہوتی ہے وغیرہ۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قربانی کا حکم رب العالمین کی طرف سے ہے، لہٰذا ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے جو حکم دیا اس کی تعمیل کریں، حکمت نہ معلوم ہو تب

بھی ہم تعمیل کریں گے، پہلے گزر چکا کہ قربانی کے دنوں میں اس سے بہتر اور محبوب عمل کوئی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قربانی کی وجہ سے جانوروں کی نسل کشی نہیں ہوتی، بلکہ یہ مسئلہ ڈیمانڈ اور سپلائی کا ہے، جس چیز کی جتنی ڈیمانڈ ہوتی ہے، اسی کے بقدر سپلائی بھی بڑھ جاتی ہے، اگر ڈیمانڈ کم ہو یا ختم ہو تو سپلائی بھی کم یا ختم ہو جاتی ہے، اسی لیے ہر سال کروڑوں جانور ذبح کیے جاتے ہیں، پھر دوسرے سال کروڑوں ان کی جگہ لے لیتے ہیں، ان میں برکت بھی ہوتی ہے، حالاں کہ قربانی کے لیے ذبح کیے جانے والے جانور ایک یا دو اور زیادہ سے زیادہ تین بچے جنتے ہیں، پھر بھی ان کی فراوانی رہتی ہے، اس کے بالمقابل کتے، بلی اور بعض دوسرے جانور کئی کئی بچے بیک وقت جنتے ہیں، پھر بھی ان کی تعداد اتنی نظر نہیں آتی جتنی قربانی کے جانوروں کی نظر آتی ہے۔

رہی بات اس کی کہ قربانی کے بہ جائے اس کی قیمت کو صدقہ کر دیں، یا رفاہ عامہ میں خرچ کریں، اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ یہ اللہ کا حکم ہے جس کی تعمیل بہ ہر حال اسی طرح کرنی ہے جیسا حکم ہے، دوسرے یہ کہ قربانی کے دنوں میں قربانی سے بہتر دوسرا عمل نہیں، خواہ وہ صدقہ ہو، تیسرے یہ کہ شریعت نے ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے اور رفاہِ عامہ کے لیے دیگر متعدّد وسائل بتائے ہیں، جن سے ان ضروریات کی کفالت ہوتی ہے، مال داروں کے اوپر زکات فرض کی ہے، صدقات وخیرات کی ترغیب دی ہے، کارِ خیر میں دل کھول کر خرچ کرنے کی تعلیم دی ہے، لہٰذا قربانی کے شعار کو مُعَطّل کر کے ان ضروریات کی تکمیل کا مطالبہ کرنا، نہ صرف حماقت ہے بلکہ حکم الٰہی کے ساتھ سرکشی اور مقابلہ ہے۔

اس اعتراض کی بنیاد دراصل غریبوں کے ساتھ ہم دردی اور رفاہِ عامہ سے دلچسپی نہیں ہے، بلکہ اسلام کے تئیں دل کا بغض اور عناد ہے جس کو اعتراض کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، کیوں کہ اگر واقعی غریبوں سے ہم دردی ہوتی تو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں خرچ کی جانے والی رقم پر اعتراض کے بہ جائے جو ناجائز، حرام یا فضول کاموں میں امت کے پیسے خرچ ہوتے ہیں ان پر روک لگا کر ان پیسوں کو مذکورہ ضروریات پر خرچ کرنے کا مطالبہ کیا جاتا: شادی بیاہ کی فضول خرچی، ناچ گانے، رقص وسرود، شراب وکباب، سگریٹ نوشی، حقہ کشی، غیر ضروری تعمیرات، لباس وپوشاک اور زیب وزینت پر بے تحاشا اور اسراف کی حد تک خرچ ـــــ اور اس طرح کی چیزوں کے خلاف ان کی زبان کیوں نہیں کھلتی، اگر زبان کھلتی ہے تو شرعی احکام کی خلاف ورزی کے لیے۔

کہا جاتا ہے کہ اس سے معیشت پر بھی زد پڑتی ہے، یہ نہایت مضحکہ خیز اعتراض ہے، کیوں کہ قربانی کی وجہ سے بے شمار لوگوں کو روزگار ملتی ہے، نہ کہ معیشت پہ زد پڑتی ہے، ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ غربت کا علاج صرف پیسے تقسیم کرنا نہیں ہے، یہ تو وقتی علاج ہے، اس کا بنیادی علاج یہ ہے کہ غریبوں کو میدانِ عمل میں لایا جائے، ان کے لیے روزگار کا بندوبست کیا جائے۔

کچھ خام خیال لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جانوروں کا گوشت کھانے سے درندگی پیدا ہوتی ہے، حالاں کہ یہ بات سائنٹیفیکلی غلط ہے، سائنسی ریسرچ کے مطابق گوشت کھانے سے بہادری، دلیری، طاقت اور قوت پیدا ہوتی ہے جس کی ضرورت ہر فرد، جماعت، معاشرے اور ملک کو ہے۔ البتہ جو درندے جانور ہیں اسلام نے ان کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔

آخری بات

تمام قربانی کرنے والے یہ ذہن نشین کرلیں کہ قربانی کا مقصد حکمِ الٰہی کی تعمیل کر کے اس کی رضا حاصل کرنا ہے، اور اس کی رضا و خوش نودی کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ یہ عمل خالص اسی کے لیے ہو، اس میں ریاء اور سمعہ نہ ہو، نام و نمود کی نیت نہ ہو، قبولیت کے لیے اخلاص کا ہونا اولین شرط ہے، اسی لیے قربانی کے سلسلے کی آیات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اس اخلاص اور تقوے کی طرف ہماری راہ نمائی فرمائی ہے۔

﴿ لَن يَنَالَ ٱللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ ٱلتَّقْوَىٰ مِنكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا۟ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ ۗ وَبَشِّرِ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٣٧﴾ ﴾ [الحج: ۳۷]

”اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس نے یہ جانور اسی طرح تمہارے تابع بنا دیے ہیں، تاکہ تم اس بات پر اللہ کی تکبیر بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت عطا فرمائی —— اور جو لوگ خوش اسلوبی سے نیک عمل کرتے ہیں، انہیں خوش خبری سنا دو“۔

[سورۂ حج: ۳۷]

اللّٰهمَّ اجْعَلْ أَعْمَالَنَا كُلَّهَا صَالِحَةً، وَاجْعَلْهَا لِوَجْهِكَ خَالِصَةً، وَلاَ تَجْعَلْ لِأَحَدٍ فِيْهَا شَيْئًا.

❊ ❊ ❊